العلم والعلماء - مرتبہ مولانا عبد الرؤف رحمانی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۰۴، قیمت دو روپیہ پتہ از مصنف پوسٹ و مقام جھنڈا بازار ضلع بستی۔

اس میں تاریخ و تذکرہ کی مستند کتابوں سے علمائے سلف کے علمی شوق و انہماک، ذوق مطالعہ، طلب علم کے لئے محنت و مشقت، اساتذہ کے احترام اور طلبہ کی ہمت افزائی، شاہان اسلام کی علم دوستی اور علماء نوازی کے ایسے موثر اور سبق آموز واقعات جمع کئے گئے ہیں جن سے علم کی عظمت و اہمیت بھی ظاہر ہوتی ہے، اور اس کی طلب و جستجو کا داعیہ بھی پیدا ہوتا ہے، یہ کتابچہ اس زمانہ کے تن آسان علماء اور سہولت پسند طلبہ کے لیے عبرت خیز ہے۔

التوحید - مترجمہ مولانا مختار احمد ندوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۵، قیمت تحریر نہیں، پتہ: الدار السلفیہ حامد بلڈنگ، مومن پورہ، مولانا آزاد روڈ، بمبئی ۱۱

الدار السلفیہ بمبئی نے اصلاحی و دینی کتابوں کی اشاعت کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس سے پہلے معارف میں اس کی بعض مطبوعات کا ذکر آچکا ہے زیر نظر رسالہ قاضی قطر شیخ احمد بن حجر آل بوطامی کی تصنیف "تطہیر الجنان والارکان عن درن الشرک والکفران" کا عام فہم اردو ترجمہ ہے، اس میں توحید کا مفہوم اور اس کی قسمیں بیان کرکے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ہر قسم کی دعا، عبادت اور استعانت صرف اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہیے، اس ضمن میں اسلام کے عقیدۂ توحید کے منافی ان اعمال و اشغال کا ذکر بھی آگیا ہے جو اس وقت مسلمانوں میں رائج ہیں۔

«ض»

جلد ۱۲۴ ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۹ء عدد ۵

مضامین

شذرات

۲۶، ۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۹ء کو مغربی بنگال کی حکومت کی طرف سے کلکتہ میں علامہ محمد اقبال کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب بڑے اہتمام اور سلیقہ سے منائی گئی، اس میں حکومت کی فیاضی اور کلکتہ کے لوگوں کی مہمان نوازی کو دیکھ کر دہلی میں امیر خسرو اور اقبال کے بین الاقوامی سمینار یاد آئے جن میں ہندوستان کے اسکالروں کی بے وقعتی ہر طرف دکھائی دیتی تھی۔

۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۷ء میں ان دونوں سمینار کے موقع پر بیرونی نمائندے تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرائے گئے، لیکن ہندوستانی نمائندوں کو تین روز کے لئے ایک بہت ہی حقیر رقم دے دی گئی کہ وہ جہاں چاہیں ٹھہریں اور کھائیں، پھر تو ان کے لئے دہلی کے کوچے مصور نظر آنے کے بجائے تنگ ہی دکھائی دئے، کلکتہ میں کوئی بین الاقوامی اجتماع نہ تھا، سو دیشی مقالہ نگار اور شاعر ہی مدعو تھے، مگر ان کو کلکتہ کے شاندار اور مشہور ہوٹل گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں ٹھہرایا گیا، مجلس استقبالیہ کے اہم ارکین کے ساتھ رضا کار ہر وقت ان کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کو پوری کرتے رہے۔

مغربی بنگال کے گورنر جناب ٹی۔ این۔ سنگھ اس کے وزیر اعلیٰ جناب جیوتی باسو وہاں کی اسمبلی کے اسپیکر جناب منصور حبیب اللہ اور ڈپٹی اسپیکر جناب کلیم الدین شمس کی طرف سے ڈنر، لنچ اور چائے کی پارٹی ہوئی جن میں یہ تمام میزبان جناب محمد امین وزیر ٹرانسپورٹ کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی سے اپنے مہمانوں سے ملے، بنگال کا سحر اور وہاں کی زلف مشہور ہے، اس تقریب کے مہمان وہاں کے

اخلاق کی سحر آمیز زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہے۔

جلسے رابندر سدن میں ہوتے رہے، اس کے ڈائس پر اقبال کی ایک بڑی تصویر نمایاں کر کے رکھی گئی تھی، رسم افتتاح اقبال کے ترانۂ ہندی سے ہوئی، جناب باسو نے افتتاحیہ تقریر کی، جناب منصور حبیب اللہ نے صدارتی خطبہ پڑھا جس میں انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اقبال کو صرف اسلامی شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا صحیح نہیں ان کی شاعری کی عالمگیریت اور آفاقیت کو بھی روشن کرنے کی ضرورت ہے۔

اس میں ایک سمینار اور مشاعرہ بھی تھا، سمینار کی صدارت کے لئے راقم کے نام کا پہلے سے اعلان کر دیا گیا تھا، میرے انگریزی خطبہ میں اتفاق سے وہ ساری باتیں تھیں جو جناب حبیب اللہ منصور صاحب چاہتے تھے، یعنی اقبال کی شاعری میں سب کچھ ہے، جلوۂ حسن بھی ہے حقیقتِ حسن بھی، تسخیرِ فطرت بھی، جلال و جمال بھی، منظر نگاری بھی، فصل بہار کی رعنائی بھی، دردِ عشق بھی فلسفۂ عشق بھی، اسرار خودی بھی، زمان و مکان کے حقائق بھی، سرگذشتِ آدم بھی، احترام آدمی بھی سیاسی بصیرت بھی، پیام مشرق بھی، جمہوریت، اشتراکیت اور اجتماعیت پر تبصرہ بھی، یورپ کی مادی تہذیب سے بیزاری بھی اور فرنگی فلسفیوں پر نکتہ چینی بھی۔

مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی) نے اقبال کو ان کے خطوط کے آئینہ میں پیش کیا، پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جموں یونیورسٹی) اس وقت تک اقبالیات کے بہت بڑے اجارہ دار ہو چکے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اقبال کی فکر پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اب ان کے فن شعری کا گہرا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کے اس فن کے کمالات ہی سے ان کی فکر نمایاں ہوئی، اس لئے انھوں نے اپنے مقالہ میں اقبال کی منظر نگاری کی خوبیاں دکھائیں، ڈاکٹر محمد حسن (جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی) نے اقبال کے مختلف پہلوؤں پر ایک بہت ہی دل آویز تقریر کی،

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے فصیح اور بلیغ انگریزی میں اقبال کے فکری پہلوؤں پر اپنا مقالہ پڑھا، پروفیسر ہیرالال چوپڑا (کلکتہ یونیورسٹی) نے اقبال پر ایسی پُرجوش تقریر کی کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی بانگِ درا سے سامعین کے ذہن پر ضرب کلیم لگا رہے ہیں، سمینار میں حاضرین کی بہت بڑی تعداد تھی، مقالے اور تقریریں بڑی متانت اور سنجیدگی سے سنی گئیں، کلکتہ کے لوگوں کا بیان ہے کہ ایسا کامیاب سیمینار یہاں پہلے کبھی نہیں ہوا۔

مشاعرہ کی صدارت ملک کے مشہور شاعر جناب علی سردار جعفری نے کی، شعراء کو سننے کے لئے بڑا ہجوم تھا، رات بھر مشاعرہ جاری رہا، جس سے اردو شعر و شاعری سے کلکتہ کے لوگوں کی غیر معمولی شیفتگی کا اظہار ہوا۔

اس تقریب کو کامیاب بنانے میں یوں تو اس کے تمام عہدیدار پیش پیش تھے، مگر مجھ کو جناب خواجہ محمد یوسف سینیر ایڈوکیٹ کلکتہ ہائی کورٹ، جناب احمد سعید ملیح آبادی، اور جناب سالک لکھنوی بہت زیادہ متحرک اور نمایاں نظر آئے، خواجہ صاحب کلکتہ ہائی کورٹ کے کامیاب ایڈوکیٹ ہیں، کیا عجب کہ بہت جلد وہاں کے جج کے عہدہ پر فائز ہو جائیں، انگریزی اچھی بولتے اور لکھتے ہیں، وہاں کے علمی حلقہ کے لئے ناگزیر سمجھے جاتے ہیں، اپنی جسمانی ضخامت کے باوجود اپنی فعالیت میں نوجوانوں کو مات کرتے ہیں، ملیح آبادی صاحب اپنے نامور صحافی باپ جناب عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم کے نامور صحافی فرزند ہیں، روزنامہ آزاد ہند کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہر حلقہ میں روشناس ہیں، اپنی نظری صلاحیتوں سے ہر حلقہ میں اثر انداز ہو کر موثر اور مقبول ہو جاتے ہیں، سالک لکھنوی صاحب معلوم ہوا کہ کلکتہ میں کاروبار کرتے ہیں، مگر یہاں کی علمی سرگرمیوں میں پورا حصہ لیتے ہیں، وجیہ شکل پائی ہے، مہمانوں کی پذیرائی میں بڑے اخلاق سے پیش پیش رہے، اس تقریب کے جنرل سکریٹری تھے۔

اس موقع پر بنگال اردو اکیڈمی بھی قائم ہوئی، بنگال کے گورنر جناب ٹی۔ این۔ سنگھ نے جو بنارس کے رہنے والے ہیں، اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ اردو ایک شیریں خوبصورت اور مقبول زبان ہے، ان کے والد اور دادا نے بھی اردو میں کچھ کتابیں لکھیں، جن کے مسودے ان کے گھر میں کچھ دنوں تک موجود تھے، جناب جیوتی باسو نے اردو اکیڈمی کے صدر کی حیثیت سے کہا کہ اردو کے فروغ میں بنگالی ہندوؤں کا بھی حصہ ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں بھرت چندر رائے، راجہ اپور بور کرشن بہادر کنور، راجہ رام موہن رائے، جنمے جے ترا ارمان، ابیناش چندر چٹرجی اور تارانی چرن تکے نام خاص طور پر لئے، اپنے سامعین کی توجہ اس طرف بھی دلائی کہ اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما ہری رت کی ادارت میں کلکتہ ہی سے نکلا، پھر تالیوں کی گونج میں یہ بھی کہا کہ جن ریاستوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہو، وہاں اردو کو ثانوی زبان ضرور قرار دینا چاہئے، ان تقریروں کو سن کر یہ خیال ہو رہا تھا کہ حکومت کی طرف سے ایسی دلپذیر اور مصلحت آمیز تقریریں ہی اردو بولنے والوں کے حصے میں آتی ہیں، مگر جب مغربی بنگال کے وزیر تعلیم نے اس موقع پر یہ اعلان کیا کہ کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیر قائم ہو رہی ہے تو بڑی خوشی ہوئی۔

کلکتہ کے ۳۶ گھنٹے کے قیام میں بڑی مشغولیتیں رہیں، وہاں کی ایران سوسائٹی اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے ملک سے باہر شہرت حاصل کر رہی ہے، اس کے بانی ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم کے اخلاص کی برکت سے اس کے مخلص خدمت گذار اس کو مزید ترقی دینے میں لگے ہوئے ہیں، اس کے موجودہ سکریٹری جناب ایم۔ اے۔ مجید ہیں جو خاموشی سے ٹھوس اور مفید علمی کام انجام دینے میں مشہور ہیں، یہاں سے انگریزی میں سہ ماہی رسالہ انڈو ایرانیکا نکلتا ہے جو اپنے سنجیدہ اور تحقیقی مضامین کی وجہ سے بہت ہی وقیع رسالہ ہے، اس کے روح رواں خواجہ محمد یوسف ہیں، ان دونوں حضرات نے اپنی غایت محبت میں میرے لئے ایران سوسائٹی میں ایک

نشست بھی رکھی، جس میں وہاں کے اور عہدیدار بھی شریک ہوئے، یہاں پروفیسر جگدیش نرائن سرکار بھی موجود تھے، جو کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے مایۂ ناز استاد رہ چکے ہیں، بہت سی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان سے پرانی ملاقات ہے، میں نے ان سے اثنائے گفتگو میں کہا کہ سر جدوناتھ سرکار نے مغلیہ دور پر کتابیں لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی، مگر ان کی تحریروں میں بڑا تضاد ہے، انھوں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ وہ لکھتے وقت جس نتیجہ پر پہونچتے اس کا برملا اظہار کر دیتے، مثلاً وہ شیواجی کو ایک قومی ہیرو قرار دیتے ہیں، مگر اس کو ڈاکو (روبر) بھی لکھ گئے ہیں۔

اس نشست میں ڈاکٹر عطا کریم برق سے بھی ملاقات رہی، جو کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی وعربی کے بڑے لائق استاد سمجھے جاتے ہیں، بڑی روانی اور بے تکلفی سے فارسی نثر لکھتے ہیں ایسی مہارت کسی ہندوستانی اہل قلم کو کم ہوگی، اسی سال ان کو حکومت کی طرف سے فارسی کے عالم کی سند بھی ملی ہے، ایران کے قاچاری دور میں شیخ صفی علی شاہ بڑے مشہور اہل دل بزرگ گذرے ہیں، جو بڑے اچھے شاعر اور نثر نگار بھی تھے، ڈاکٹر عطا کریم برق نے ان پر جستجو در آثار صفی علی شاہ" کے نام سے فارسی میں جو ایک کتاب لکھی ہے، وہ تہران سے شائع کی گئی ہے۔ فارسی میں ان کی نثر نگاری کی یہ بہت بڑی سند ہے۔

مولانا محفوظ کریم معصومی (مدرسۃ العالیہ کلکتہ) سے عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تو لپٹ کر ملے اور بڑی اپنائیت دکھائی، عربی اچھی بولتے اور لکھتے ہیں، اردو میں بھی برابر اچھے مضامین لکھا کرتے ہیں، اس وقت مدرسۃ العالیہ کے روح رواں بنے ہوئے ہیں۔

جناب شمس کلیم کی چائے کی دعوت میں ڈاکٹر محمد صابر خاں سے بھی ملاقات ہوئی، بنگال کے مشہور اہل قلم ہیں، ابھی عربی کی ایک کتاب التاجی ایڈٹ کی ہے، زیادہ تر انگریزی میں لکھا کرتے تھے، اب اردو میں بھی لکھنے لگے ہیں، بنگال پبلک سروس کمیشن کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔

اس قیام میں ڈاکٹر مجیب الرحمن صدر شعبۂ فارسی مولانا آزاد کالج بہت ہی اخلاق و اخلاص کے برابر ملتے رہے، انگریزی میں اپنی ایک تصنیف ہسٹری آف مدرسہ ایجوکیشن اور اردو میں تاریخ بارہ گاؤں

دی، وہ بنگال کے مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں، اس لئے وہاں کے مدرسوں پر ایک پُر از معلومات کتاب لکھنے میں ان کو ہر قسم کی مدد حاصل ہوئی، ان ہی کے ہونہار صاحبزادے جناب رئیس انور رحمان نے جنمے جئے متر ارمان کے تذکرہ نسخۂ دل کشا کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، اس میں انھوں نے مقدمہ اور تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے اچھے علمی و ادبی مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے، اس کی جو رسم اجراء ڈاکٹر محمد حسن کی صدارت میں ایران سوسائٹی میں ہوئی، اس میں بھی شرکت کا موقع ملا، اس تذکرہ کو پڑھ کر مسرت ہوئی کہ ایک بنگالی ہندو نے اردو کی تذکرہ نگاری میں بھی حصہ لیا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے والد جناب تلوک چند محروم کے کلام کا مجموعہ نیرنگ معانی عطا کیا، انھوں نے اپنے والد پر "تلوک چند محروم" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے، وہ بھی دی، اپنی نظموں کے دو کتابچے "ماتم سالک" اور "شاعر کی آواز" بھی دئے۔

جناب ابو بکر جیلانی نے اپنی تصنیف "کنور ایک عظیم بنگالی شاعر" لاکر دی، بہت عمدہ چھپی ہے، دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی، اس میں انھوں نے اپورو کرشن چندر کنور کی شاعری کا جو تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس سے ان کی ادبی خوش مذاقی اور تصنیفی خوش سلیقگی کا اظہار ہوتا ہے، کنور کی غزلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ ایک بنگالی ہندو شاعر بھی اردو کے غزل گویوں میں نمایاں جگہ پا سکتا ہے۔

پرویز شاہدی میرے ہمدرس اور ہم جماعت تھے، جوانی میں وفات پا گئے، پٹنہ کے رہنے والے تھے، مگر کلکتہ پہونچ کر اپنی سخن سنجی میں ایک منفرد حیثیت حاصل کر لی تھی، وہاں بہت مقبول ہوئے ان کی نظمیں اور غزلیں اب بھی وہاں شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں، ان کے کلام کا ایک مجموعہ تثلیث حیات ان کی بیگم صاحبہ نے پیش کیا، جس کو ہاتھ میں لیتے ہوئے حسرت کے ساتھ پرویز شاہدی کی طالب علمی کا زمانہ یاد آ گیا۔

پروفیسر عبدالستار شاہدی صدر شعبۂ فارسی واردو ڈھنگی کالج چنسورہ نے بقا نظامی عظیم آبادی کا مجموعۂ کلام 'صہبائے بقا' لاکر دیا، جو بڑے اہتمام سے طبع ہوا ہے، حضرت بقا عظیم آباد سے کلکتہ آئے پھر اڈیسہ چلے گئے، جہاں سے ۱۹۶۹ء میں پاکستان جا بسے، ان کے شعری اور نثری کارناموں کو جناب عبدالستار شاہدی نے جس طرح نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے ایسی خوش قسمتی کسی شاعر یا مصنف کو اپنی زندگی میں کم حاصل ہوئی ہوگی۔

انجمن مفید الاسلام کے جناب محمد اسحٰق صاحب عرف مولانا عزیزانہ طور پر ملے اور اپنا ایک غیر مطبوعہ مضمون "اقبال جذباتی ہم آہنگی کے آئینہ میں" دے کر اس پر رائے لکھ کر بھیجنے کو کہا، جناب آغا رشید مرزا دہلوی نے جو ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کے خاندان سے ہیں، اپنا ایک مطبوعہ مضمون "کاہے کو دینی بدیس: دلی کی شادیاں" پڑھنے کو دیا، جس کو ریل گاڑی ہی پر پڑھ کر محظوظ ہوا، ان ادبی نوازشات کے ساتھ جناب منظور احمد صاحب مالک رائل ہوٹل زکریا اسٹریٹ نے ایک پُرتکلف دعوت سے تواضع کی، وہ دارالمصنفین کے رکن دوامی بھی ہیں، جناب حاجی عبدالقیوم صاحب مالک امینیہ ہوٹل کلکتہ کے فلاحی کاموں میں برابر حصہ لیتے رہتے ہیں جس سے ان کی ایک امتیازی حیثیت ہوگئی ہے، وہ برابر ساتھ رہے اور اپنے رس بھرے اخلاق سے گراں بار کیا، عارف کریم صاحب انجینیر ہیں، مگر جماعت اسلامی کے ہفتہ وار ریڈینس کے خصوصی نمایندے بھی ہیں، گفتگو میں اپنی مذہبی حمیت کا اظہار کرتے رہے۔

کلکتہ کے قیام میں یہ اثر ہوا کہ یہاں کے علمی میکدہ میں اردو زبان وادب کے شیشہ وساغر بھی خوب جھنکتے اور چھلکتے رہتے ہیں، جس پیمانہ پر اس کی بادہ خواری اور سرشاری یہاں جاری ہے اس سے اس زبان کے قوی اور صحت مند رہ کر زندہ رہنے کا ثبوت فراہم ہوا۔

مقالات

سنائی کا مذہب

از ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مشہور سنائی شناس آقائے مدرس رضوی نے دیوان سنائی کے مقدمہ میں سنائی کے مذہب کے بارے میں لکھا ہے:

"واز آثار واشعارے کہ یادگار جوانی وآغاز شاعری او می باشد معلوم می شود کہ حکیم در ابتداء حال قطعاً پیرو اہل سنت وجماعت وبرکیش ومذہب امام اعظم بودہ است ومدایحے کہ ابوحنیفہ راگفتہ وہنوز در دیوانِ او باقی است دلیل آنست، ازجملہ قصیدہ ایست در بطلانِ حجت دہریان (ص ۲۳۸، دیوان حاضر) کہ سرتاسرآں مدح امام اعظم است و مسلماً اگر دراں وقت حکیم شیعی می بود ہیچگاہ چنیں مدحے از ابوحنیفہ نمی کرد، بنابرایں در حنفی بودن وے دراں وقت جائے شک وشبہہ نیست، اما در اواخر عمر وہنگام نظم حدیقہ بطور قطع ویقین دیگر پیرو مذہب ابوحنیفہ نبودہ وایں ابیات حدیقہ:

اے ترا راہ گشتہ رائے وقیاس — بتر از راہ دینِ خود مشناس

راہ دین ست محکم تنزیل — شرع را مرتضیٰ دہد تاویل

جز ازیں جملہ ترہات شمر — کار خود کن، بقول کس منگر

کہ رائے وقیاس راکہ اساس وپایۂ مذہب ابوحنیفہ است بدترین راہہا خواندہ،

دلیل قطعی است کہ وے در یں وقت بر مذہب امام اعظم نبودہ و مذہب دیگرے جز مذہب حنفی داشتہ است، ولیکن معلوم نیست کہ بعد ازاں بمذہب شافعی کہ نزدیک ترین مذاہب اہل سنت و جماعت بمذہبِ شیعہ است گرویدہ ویا چناں کہ جمعے ادعا کردہ اند کیش شیعہ را اختیار کردہ است۔"

اس بیان کا خلاصہ یہ ہے :

۱۔ یہ بات یقینی ہے کہ جوانی اور شاعری کے آغاز میں وہ امام اعظم کے پیرو یعنی حنفی تھے،

۲۔ یہ بات بھی قطعی ہے کہ آخر عمر میں خصوصاً حدیقہ سنائی کے نظم کرنے کے موقع پر وہ حنفی نہ تھے، اس لئے کہ حدیقہ کی ابیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ راے و قیاس کو بدترین راہ سمجھتے تھے، اور یہی روش امام اعظم کی تھی۔

۳۔ ممکن ہے وہ شافعی ہوں، یا یہ بھی قیاس ہوسکتا ہے کہ وہ شیعہ ہوگئے ہوں۔

دراصل آقاے مدرس رضوی کے اس بیان کی تہ میں ان کی یہ خواہش مضمر ہے کہ سنائی کسی طرح شیعہ ثابت ہوجائیں، لیکن سنائی کے کلام میں واضح طور پر ایسے دلائل و شواہد موجود ہیں جن کی بنا پر ان کو بغیر تاویل و توجیہ کے شیعہ نہیں کہہ سکتے۔ ان کے ہاں خلفاء اربعہؓ کی مدح تواتر کے ساتھ نظم، نثر، قصائد، مثنویات وغیرہ میں ملتی ہے، علاوہ بریں انھوں نے امام اعظم کی مدح بھی اسی آب و تاب سے کی ہے۔ حدیقہ میں امام اعظم کے ساتھ ہی ساتھ امام شافعی کی بھی بڑی تعریف کی گئی ہے، اس کا ذکر آگے آتا ہے، ایسے حالات میں آقاے مدرس رضوی نے یہ توجیہ پیش کی کہ شروع میں تو وہ یقیناً حنفی تھے، لیکن آخر میں شافعی ہوئے جو مذہبِ شیعہ کے نزدیک ہے، یا واقعی شیعہ ہوگئے تھے۔ اب میں سب سے پہلے آخری عہد کے کلام کا ایک جائزہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں :

سنائی کی حدیقہ ۵۲۵ھ کے حدود میں لکھی گئی اور اس لحاظ سے یہ مثنوی ان کے آخری کلام میں سب سے زیادہ نمایاں مقام کی حامل ہے۔ اسی آخری کلام میں سنائی نے اول حضرت امام اعظم، پھر امام شافعی، پھر دونوں کی ایک الگ عنوان کے تحت تعریف کی ہے، ذیل میں ہر عنوان کے تحت کچھ اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن سے سنائی کے مذہب پر بخوبی روشنی پڑتی ہے :

مدح امام مسلمانان ابوحنیفہ نعمان[1] بن ثابت رضی اللہ عنہ

همه را باز راے نعمانی   آشتی دادہ بر مسلمانی

آفتابِ سپہر معروفی   بدر دیں بو حنیفۂ کوفی

همه را از پے صلاحِ جہاں   مغز سنت نہادہ اندر جاں

از پے نطنت و ہدایتِ او   پادشاہاں بزیرِ رایتِ او

پادشاہِ ائمۂ دیں بود   علم ز حلم و سخاش آئیں بود

راہ دیں بر خلایق آساں کرد   همه را در اصول یکساں کرد

علم او کردہ جملہ را یک رنگ   گشتہ ناچیز زرق و حیلہ و رنگ

بودہ در زیر گنبد ازرق   حجت صدق در محجّۂ حق

دیدہ بے واسطہ حکایت و نقل   چہرۂ سنت از دریچۂ عقل

---

[1] حدیقہ چاپ مدرس رضوی میں اشعار سے قبل یہ عنوان آیا ہے: "فی مناقب الامام الاعظم الزاهد مفتاح الشریعة کنز الذریعة نظام الدین قوام الاسلام ابی حنیفة نعمان بن ثابت الکوفی رحمة الله علیه ؛ ذکر النعمان صون عن الحرمان، قال الشافعی رضی الله عنه: الفقهاء کلهم عیال ابی حنیفة رحمه الله۔" ص ۲۷۲۔

حجت اصل و فرع نعماں بود — نعمت جان شرع نعماں بود

در رہِ بو حنیفۂ کوفی — پا یتاں ہمچو خرقۂ صوفی

باز بہر کمال کسب دیار — دست تاں جوں قبائے روز بہار

صدق او در قضائے قدوسی — باز گشتہ چو بالِ طاؤسی

دادہ اورا برائے دولت و دیں — دل و جانش ز علم و فضل و یقیں

حجتِ اوست واضح و واثق — نکتۂ اوست لایح و لایق

بخت او چوں بہار امیر جہاں — خردش چوں شگوفہ پیر و جواں

پیر و انش زما درود و سلام — باد خشرم بدو بدار سلام

(کلیات اشعار چاپ کابل ص ۷۹، بعد)

ان اشعار کی روشنی میں آقائے مدرس رضوی کا یہ قول کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ سنائی حدیقہ لکھتے وقت قطعاً امام ابوحنیفہ کے پیرو نہ تھے، حالانکہ خود اسی مثنوی میں امام صاحب کی تعریف کے بعد واضح طور پر وہ دعا کرتے ہیں کہ خدا! میرا حشر ان کے ساتھ کرے، اس سے زیادہ امام اعظم کی پیروی کے لئے اور کون سی دلیل درکار ہے، اس کے بعد امام شافعی کی تعریف کی ہے، اس سلسلہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مدح امام الایمہ محمد ادریس الشافعی رحمۃ اللہ علیہ

چوں فرو شد چراغِ دینِ نبی — روے بنمود ماہِ مطّلبی

درسِ دیں ساخت از پے تقدیس — صدرِ سنت محمّد ادریس

نسبتِ اوست دیدہ مرجاں را — سنتِ اوست عقل و ایماں را

از پے طالبانِ نورِ یقین — خویشتن وقف کردہ بر درِ دین

اوست در راہِ دیں امام بحق — کہ امامت ورا سزد مطلق

ہر حدیثے کہ مہترِ دیں گفت — شرحِ آں داد و علمِ آں بنہفت

کلکِ او شد خزانۂ اسرار — درسِ او را فرشتہ کرد نظار

گاہ تدریس و گاہ شرحِ علوم — حاکم او بود و عالمے محکوم

بر خود و عقلِ خویش ہیچ نساخت — در رہِ شرع خویشتن درباخت

در تراجع ز حسن و خلقش دیں — با ترفع ز علم و حلمش دیں

مصطفیٰ گفتہ او شنیدہ بجاں — زاں نمودہ بشرع او برہاں

تا حدیثِ پیامبراں خواندہ — بر خودش اعتماد ناماندہ

راکبانِ درش اثیر فرس — ہمرہانِ درش عبیر نفس

جودِ او ہمچو کعبہ آینہ جوے — خلقِ او چوں بہارِ خنداں روے

یافتہ حلّہ صفا و مصاف — دست و کلکش چو طبع دیبا باف

بود کوتہ ز بہر شرع و شعار — دست او ہمچو زیر پوش بہار

(کلیات اشعار ص ۸۰ - ۸۱)

واضح رہے کہ امام اعظم کے پیرو کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایمہ اربعہ کے بارے میں نہ صرف حسن ظن بلکہ ان سے محبت و عقیدت رکھے، اس اعتبار سے سنائی کی حضرت امام شافعی کی مدح سرائی ان کے حنفی ہونے میں مانع نہیں، آپ ملاحظہ کریں گے کہ شاعر نے جس طرح امام اعظم کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے، ویسی ہی وابستگی امام شافعی کے اشعار میں نہیں ملتی۔

اب ذیل میں دونوں اماموں کی ساتھ ساتھ مدح سرائی کی جاتی ہے:

درمناقبِ ہردو امام گوید

ہردو ہمراہِ راہِ دیں بودند   ہردو ہم کاسۂ یقیں بودند

آں[1] یکے آفتاب محفل و صدر   واں[2] دگر بدر لیک در شب قدر

آں بفرقد نہادہ مرقدِ خویش   واں زاسناد کردہ مسندِ خویش

آں بحجت گرفتہ سرمایہ   واں زسنت بہ بستہ پیرایہ

آں بدل تیغِ حجۃ الوسطیٰ   واں چراغِ محجۃ الوثقیٰ

آں یکے پیشوائے راہِ صواب   واں دگر مہتدی بگاہِ جواب

آں یکے آفتاب دین افزائے   واں دگر رہنمائے دین خدائے

آں امامِ مدرسِ زاہد   واں دگر بادیانت و عابد

آں بسان ستارۂ کیواں   واں چو جوزا بنور خور درخشاں

آں بکرِ دار قلزمِ اخضر   واں بگفتار حیدر صفدر

آں بمعنی مثالِ بحرِ محیط   واں مدعوئے جہانِ علم بسیط

آں شدہ حکم شرع را حاکم   واں بُدہ علم محض را عالم

آں یکے شرع را چو ارکانست   واں مر اسلام را تن و جانست

آں بحجت چراغِ دینِ رسول ؐ   واں بسنت جمالِ آلِ بتول

کوفی اندر طریقِ دیں کافی   شافعی درد جہل را شافی

لطفِ ایں دادہ بیخ دیں را آب   قہرِ آں کردہ قصرِ کفر خراب

ہردو بودہ ز اجتہاد قوی   سازگارِ ستارۂ نبوی

---

[1] یعنی امام اعظم   [2] یعنی امام شافعی

ہر دو را دل بشرعِ حاذق بود   ہر دو را صبح شرعِ صادق بود

جانِ من ہر دو را فدا بادا   عقل را قولِ شاں غذا بادا

بادیہ داں زہر دو آں خوشنود   کہ بسے خلق یافت زایشاں سود

تو کہ اندر خلاف ہر دو بوی   از بد و نیک ہر دو تن تو گوی

تو کہ دیں را بکیں بدل کردی   تو چہ دانی حدیث یک وردی

خائن و خاسر آں کسے را داں   کہ زگفتارِ شاں بتافت عناں

تا نہ گردد تباہِ کار و سفیہ   ندرد پوستینِ مردِ فقیہ

تو کہ یک مسئلہ را ندانی حل   با سخن داں چرا کنی تو جدل

قامت شد دوتا ز بد خوئی   کہ چرا قامتِ تو یکتوئی

قامتِ آں دوتا ز زشتی خو   کہ چرا قامتِ فلاں یکتو

ایں دوتا کردہ باز قامت راست   کہ چرا قامت فلان یکتاست

دور دور است ساسی از شاہی   ہمچو راز الٰہی از لاہی

اندر پند و نصیحت ہر دو اصحاب گوید

اے ہوا کردہ زیر بار ترا   با چنیں اژدہا چہ کار ترا

از برائے سگان و گرگاں را   ایں چنینہا مگو بزرگاں را

ایں ہمہ داعیانِ اللہ اند   نہ از آنہا کہ داعیٔ جاہ اند

دیں طلب کن گرت غم اینست   کہ کلید درِ دل از دین است

ہیچ را در جہاں ز جہل و ز ظن   بے خبر وار پائے پشت مزن

از پے شاخ و بیخ شرع مکن   وز پے جاہ راہ خلق مزن

یک جهانند زیر این افلاک ‏ کام پُر زهر و خانه بے تریاک

همه خود را گرفته اندر چنگ ‏ همه با سایهٔ خود اندر جنگ

همه از آب این دو روزه نهاد ‏ تازه و تر چو رودهٔ پُر باد

تو هوس دانی و هوا و جدل ‏ در پے عامه گاو و گرد خیل

جز هوا و هوس نیارد کیں ‏ شافعی آں و بو حنیفه چنیں

تو چه دانی که بو حنیفه که بود ‏ چه شناسی که شافعی چه شنود

گر ترا بو حنیفه [illegible] دیو نمود ‏ او سوی حق بجز فرشته نبود

شافعی ار سوی تو بولهب است ‏ بسوی حق امین و حق نسب است

همه نیک اند بے حکومت تو ‏ تو بدی واں سگ خصومت تو

سگ کیں از بغل برون انداز ‏ سگ بنه زیر بغل میا [illegible]

مه از دستِ خود بشهوت و کیں ‏ پس بتحصیل عامه داداں دیں

کم کن ایں گفت و گوے بهر خدائے ‏ گنگ شو ساعتے و ژاژ مخائے

حسد و جهل کرد آلتِ جنگ ‏ دیو حقدرت گرفته اندر چنگ

هر کرا چشم عقل کور بود ‏ نبود آدمی ستور بود

زیں چنیں ترهات دست بدار ‏ کار کن بگذر از رهِ گفتار

ناصحم قولِ من بکو بشنو ‏ ورنه کم کن سخن بدوزخ شو

بنده ام بنده ام امامان را ‏ نشنوم قول خام خاماں را

کاشف شبهت تو قرآنست ‏ واضح حجت تو قرآنست

من بگفتم نصیحتے در دیں ‏ گر بهی ور بدی تو دوم ایں

گر نه بدنگیر بر من کیں ‏ ور چنینی چنیں مکن در دیں

من اگر جمع یا پریشانم ‏ هر چه هستم از آن ایشانم

من نمودم ترا طریقِ نجات ‏ ور نخواهی سر تو در سی تات

(کلیات اشعار ص ۸۱ - ۸۴)

اوپر جو اشعار نقل کیے گئے ہیں ان سے واقعہ کی صحیح حقیقت معلوم ہو جاتی ہے، سنائی کے دور میں حنفیوں اور شافعیوں میں بڑا اختلاف تھا، اس کے نتیجے میں احناف اور شوافع نہ محض ایک دوسرے پر رکیک حملے کرتے، بلکہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ امام اعظم اور امام شافعی بھی ان کے حملے کی زد میں آگئے، سنائی اس سے بے حد متاثر اور دلگیر تھے، چنانچہ انھوں نے ان دونوں ائمہ کے موقف کی پوری وضاحت کی اور ثابت کیا کہ دونوں حق پر تھے اور اس لحاظ سے دونوں کے پیرو راہِ راست پر ہیں، نہ کسی کے پیرووں کو اور نہ ان حضرات کو ہدفِ ملامت بنایا جائے، جو لوگ محض حسد و کینہ کی وجہ سے عوام میں اپنا اقتدار بڑھانے کی بنا پر امام اعظم یا امام شافعیؒ کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں، وہ جاہل محض ہیں، علم سے ان کا کوئی سروکار نہیں، دونوں امام حق پر ہیں، ان کی پیروی درست ہے، کسی کو بُرا کہنے سے خود اپنا ایمان معرضِ خطر میں ہے، خود سنائی اگرچہ حنفی تھے مگر جس طرح وہ امام اعظم کو محترم جانتے اسی طرح ان کے نزدیک امام شافعی بھی ہر طرح کے احترام کے مستحق تھے، وہ دونوں اماموں کے بندہ تھے، اور ان کے نزدیک یہی راہ درست تھی، دراصل دونوں میں فرق کرنا خامی اور جہل کی دلیل ہے، یہ اشعار حدیقہ کے ہیں، ان اشعار کی روشنی میں آقاے مدرس رضوی کے قول کو پرکھا جاتا ہے، ان کے خیالات ہیچ و پوچ اور بے بنیاد ٹھہرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"لیکن وہ (سنائی) اپنی حیات کے آخری دور میں خصوصاً حدیقہ نظم کرتے وقت قطعی اور یقینی طور پر وہ ابو حنیفہ کے مذہب کے پیرو نہ تھے، اور حدیقہ کے یہ اشعار:

اے وہ شخص کہ تو نے رائے و قیاس کو اختیار کر رکھا ہے، یہ بدترین راہِ دین ہے، جو تو نے اختیار کر رکھی ہے، راہِ دین محکم تنزیل ہے، در اصل شرع کی تاویل حضرت علیؓ کے وجود سے ہے، اس کے علاوہ بقیہ سب بکواس ہے، تو اپنا کام کر اور دوسرے کی بات نہ سن۔

رائے و قیاس کو جو مذہب ابو حنیفہ کی اساس ہے، بدترین راہ بتاتے ہیں، اس بات کی دلیل ہیں کہ سنائی امام اعظم کے مذہب پر نہ تھے۔"

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک مشہور سنائی شناس "حدیقہ میں مندرج سیکڑوں اشعار جن میں شاعر امام اعظم اور پھر امام شافعی سے اپنی وابستگی نہایت واضح طور پر ظاہر کرتا ہے" یہ کیونکر کہہ سکتا ہے کہ وہ امام اعظم کے پیرو نہ تھے۔ لطف یہ ہے کہ جن تین اشعار کی روشنی میں انھوں نے رائے و قیاس کی راہ کو بدترین راہِ دین لکھا ہے ان کی نوعیت اس لحاظ سے مشتبہ ہے کہ وہ کلیات اشعار حکیم سنائی (نسخۂ کابل) سے خارج ہیں ثانیاً خود سنائی اپنے آپ کو واضح طور پر امام اعظم کا پیرو قرار دیتے ہیں، اور حدیقہ کے پچاسوں اشعار میں اپنے اس عقیدے کا اظہار کرتے ہیں، ایسی صورت میں آقائے مدرس رضوی کا حدیقہ کے تین شعر سے جن میں رائے و قیاس کی مذمت کی گئی ہے، یہ استدلال کہ ان کی نسبت امام اعظم کی طرف ہے، اور اس بنا پر سنائی امام اعظم سے بے زار ہیں لغو اور مہمل توجیہ ہے اس لئے کہ سنائی کے بیان کا یہ تضاد کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

اب تک حدیقہ سنائی سے جو ان کی آخر عمر کی تالیف ہے استشہاد ہوا ہے کہ سنائی

آخر عمر تک حنفی تھے، اب دیوان سے ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو حضرت ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کی بزرگی و احترام پر دلالت کرتے ہیں:

قاضی عبد الودود کی مدح اس طرح شروع ہوتی ہے:

اے چو نعمان بن ثابت در شریعت مقتدا — وے بحجت پیشوائے شرع و دینِ مصطفےٰ

از تو روشن راہِ حجت ہمچو گردون از نجوم — وز تو شاداں اہلِ سنت ہمچو بیمار از شفا

یہ ابیات ۵۰۹ھ سے قبل لکھے گئے ہوں گے، اس لئے کہ قاضی مذکور سلطان مسعود شاہ غزنوی متوفی ۵۰۹ھ کے دور میں قاضی غزنین تھے، قاضی کا سنی اور حنفی ہونا اظہر من الشمس ہے،

قاضی محمد بن منصور سرخسی کی مدح میں یہ ابیات آئے ہیں:

آفتابِ عقل و جاں اقضی القضاۃ دیں کہ ہست

چوں قضائے آسماں اندر زمیں فرماں روا

آں سر اصحابِ نعمان کز پے کسب و شرف

ہر زمانے قبلہ بر پالش دہد قبلہ دعا

رفت سید از جہاں و چند مشکل کرد حل

بو حنیفہ رفت و زو در گرد عالم قال ماند

دختر خود بتو شہ وادم زیرا کہ توئی — مصطفےٰ سیرت و حیدر دل و نعماں مذہب

(مظاہر مصفا، ص ۴۴)

بو حنیفہ گرچہ بود اندر شریعت مقتدا — کس نہ شست از آب نسوخی سخنہائے زفر[1] (ص ۲۸۰)

[1] یہ اصحاب ابو حنیفہ میں تھے۔

دررهِ دیں چو بوحنیفه زعلم   چوں چراغے بجز منیر مباش

(ص ۳۲۳)

بوحنیفه وار پاے شرع بر دنیا نهیم   بوهریره وار دست صدق در انبان کنیم

(ص ۴۱۳)

چوں بدار الملک عباسی امامی آمدیم   تازه رخ چوں برگ و شاخ از قطرهٔ باران شویم

از براے حقِ صاحب مذهب اندر تهنیت   سر قدم سازیم و سوے تربتِ نعماں شویم

(ص ۴۱۶)

ذیل میں اس منظومہ کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جو امام اعظم اور ایک دہری کے مناظرے سے متعلق ہے (دیوان ص ۲۳۸ ببعد)

اے خردمند موحد پاک دینِ هوشیار   از امامِ دینِ حق یک حجت از من گوش دار

آں امامے کو ز حجت بیخ بدعت را بکند   نخلِ دیں در بوستانِ علم زو آمد ببار

آنکه در پیشِ صحاباں فضلِ او گفتے رسول   تا قیامت داد علمش کارِ خلقاں را قرار

شمعِ جنت خواند عمر را نبی یکبار و بس   بوحنیفه را چراغِ امتاں گفت او سه بار

چوں بدید آمد بگو که بوحنیفه تاجِ دیں   آنکه شد از علم او دینِ محمدؐ آشکار

گفت گردد امتم هفتاد و سه فرقت بهم   هست یک زاں اهلِ جنت را مرجع دیگر بنار

بوحنیفه سر در آں قوم اهلِ جنت است   ملحد و اهلِ هوا از وے شود مقهور و خوار

دهرئے آمد بنزدیک خلیفه ناگهاں   بعض دینے مبغضے شوخے پلیدے نابکار

ایں چه بد است از شریعت بر تنت گفت اے امیر   یافتی پادشاهی خوش خور و بے غم گذار

می چنیں گوید که زرق است ایں مسلمانی و فن   دیں شریعت چوں روائی کش بنودست و دنار

گفت امیر المؤمنیں تا حاضر آید پیشِ او   دینِ ایزد را و شرعِ مصطفیٰ را پشت و یار

گفت قاصد را امامِ دیں چوں بگذارم نماز   پیشِ میر المؤمنیں آیم ورا گو چشم دار

تا نمازِ شام نامد بوحنیفه پیشِ شاه   چهره گشته دهری آنجا شاه بُد در انتظار

اندریں بودند ناگه کاں در آمد مردِ دیں   شاد گشت از وے خلیفه دهریک در مانده وار

گفتش از خجلت که اے نعماں چرا دیر آمدی   داد نعمانش جوابے پُر معانی مرد وار

گفت حالے چوں شنیدم امر شه برخاستم   رخ نهادم سوے قصر و تختِ شاهِ تاجدار

چوں رسیدم بر کرانِ دجله کشتی رفته بود   بود نخلے منکر آنجا تخته باشد بر قطار

در هم آمد کشتئے شد در زمانش ناپدید   خود بخود بنشست آنجا بر کرانِ رودبار

کشتئ آنکه پیش آمد من نشستم اندرو   زیں سبب تاخیرم افتاد اے پسر معذور دار

گفت ملحد شرم دار اے بوحنیفه زیں دروغ   حجتے آور که ایں کس ندارد استوار

گفت آنگه بوحنیفه آں امامِ دینِ حق   مر امیر المؤمنیں را کاے امیرِ با وقار

خصم می گوید که صانع نیست عالم بُد قدیم   ایں ز طبعت و هیولیٰ نیست ایں را کردگار

آنکه منکر همی گردد که مصنوعات را   صانعے باید مگر دیوانه است ایں گوش دار

بگرواے ملحد بقرآں قل هو الله یاد گیر   چند باشد بر سرت از جهل و کفر و شک غبار

چوں شنید ایں حجت از وے دهریک خاموش گشت   کرد هر یک خوار او را پس بکردندش بدار

گفت نعماں اے خلیفه بعد ازیں چونیں مکن   ملحداں را پیشِ خود منشاں ازیں پس زینهار

هر چه فرماید ترا قرآن و اخبارِ رسولؐ   اندرو آویز و ملحد را ز مجلس دور دار

گفت پذرفتم ز تو اے حجتِ دینِ خداے   شاد باش اے بوحنیفه اے امامِ بردبار

اے سنائی شکر ایں دانی که بتوانی گزار   دینِ اسلام و امامِ عالم و پرهیزگار

گر سنائی مستجب گردد بآتش بے گماں — زیں مناقب رستہ گردد اے برادر گوش دار

ان اشعار کی روشنی میں یہ تصور کہ سنائی امام ابو حنیفہ کی پیروی ترک کرکے دوسرا مذہب اختیار کر چکے تھے، سراسر بے بنیاد اور بعید از قیاس ہے۔

دراصل سنائی کے مذہب کے بارے میں غلط فہمی کی بنیاد اس امر پر ہے کہ وہ آل سفیان کے مثالب کے قائل تھے جیسا کہ ان کے مختلف بیانات سے ظاہر ہے، مثلاً بہرام شاہ غزنوی (۵۱۱ - ۵۴۷) کے نام جو خط ہے، اس میں لکھتے ہیں:

دو دلیل بر آنکہ بجہل تصرف می کنند آنست
کہ می گویند آل مروان را نکوہیدہ است
تفضیل امیر المومنین علیؓ را بر دیگر صحابہؓ
نہادہ است، و آں نمی بینند کہ او را
فرود صدیق الاکبرؓ بلکہ فرود از فاروقؓ و
ذی النورینؓ نہادہ چنانکہ ایمۂ سلف نہادہ اند
و از سید کائنات مرتبت محمد مصطفےٰ صلوات اللہ
علیہ اخبار صحیح مروی است و سلف صالحین
بر آں اند و مناقب آل رسول صلوات اللہ علیہم
و مثالب آل سفیان اگر دروغ است
دکانۂ الناس نہ بر آں ہستند، عقلاً
دانند کہ چنین است و کلمۂ الحق است
لا کلام فیہ۔

اور اس بات کی دلیل کہ وہ جہل سے
کام لیتے ہیں، یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ آل مروان
کی نکوہش کی ہے اور امیر المومنین علیؓ کو دیگر
صحابہؓ سے افضل ٹھہرایا ہے، لیکن وہ یہ نہیں
دیکھتے کہ حضرت علیؓ کو حضرت صدیق اکبرؓ
سے کم درجہ پر بلکہ حضرت فاروقؓ اور حضرت
عثمان ذی النورینؓ سے نیچے جیسا کہ اسلاف
کا قاعدہ تھا، رکھا ہے، اور سید کائنات
محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخبار صحیح
مروی ہے، اور سلف صالحین کی بھی یہی
روش رہی ہے، اور آل رسولؐ کے مناقب
اور آل سفیان کی نکوہش اگر غلط ہے،
اور عوام الناس کا یہ عقیدہ نہیں ہے تو

نہ ہو، اہلِ دانش جانتے ہیں کہ ایسا ہی ہے
اور یہی کلمۂ حق ہے۔ اور اس بات میں
کوئی کلام نہیں۔

حدیقۂ سنائی کے مطبوعہ نسخے کے ان اشعار میں یہی خیال ملتا ہے:

شادمان مصطفےٰ و یارانش — وآنکہ ہستند دوستدارانش
چار یار گزیدہ اہل ثنا — بر تن و جانِ شاں زبندہ دعا
مرتضیٰؓ و بتولؓ و دو پسرشؓ — وانکہ سوگند من بود بسرش
نخورم غم گر آلِ بو سفیان — نشوند از حدیثِ من شاداں
... مرا مدح مصطفےٰ ست غذا — جان من باد جانش را بفدا

... ...

اور دیوان کے بعض نسخوں میں یہ قطعہ بھی ملتا ہے:

داستانِ پسرِ ہند مگر نشنیدی — کہ از و بر سرِ اولادِ پیمبرؐ چہ رسید
پدرِ او لب و دندانِ پیمبرؐ بشکست — مادرِ او جگرِ عم پیمبرؐ بمکید
خود بناحق حقِ داماد پیمبرؐ بگرفت — پسرِ او سرِ فرزند پیمبرؐ ببرید
بر چنیں قوم چرا لعنت و نفریں نہ کنم — لعنت اللہ یزیدا و علی حب یزید

(ص ۱۰۷۲)

اس کے علاوہ ایک جگہ یہ بیت آئی ہے:

پیشتر زیں چہ کرد با سادات — شمر یا ہند زادہ یا ملجم

(ص ۳۷۹)

اس سلسلہ میں یہ ابیات بھی قابلِ غور ہیں:

دینِ حسین تست آزو آرزو خوک و سگ است ؛ تشنہ ایں دامی کشی واں ہر دو دامی پروری

بر یزید و شمرِ ملعوں چوں ہمی لعنت کنی ؛ چوں حسین خویش را شمر و یزید دیگری

(دیوان ص ۶۵۵)

گویا یزید و شمر ملعون پر لعنت کا حق انہی کو ہے جن کو اپنے دین کا صحیح پاس و لحاظ ہو، بد دین و بے دین تو خود یزید و شمر کی ردیف میں ہے، ان پر لعنت کا کیا موقع ہے۔

آلِ مروان اور آلِ زیاد واجب القتل ہیں، حدیقہ میں آیا ہے:

آنکہ جز ابلہ و منافق نیست ... مر ورا شرم خلق و خالق نیست

کردہ خصمانِ او چہ بندہ چہ حُر ... مطبخ اینجا و دوزخ آنجا پُر

آلِ مروان و آلِ سفلہ زیاد ... کہ نہ رفتند جز براہ عناد

ہر کہ باشد خوارج و ملعون ... واجب آنست کش بریزی خون

(ص ۷۸)

لیکن ان امور کے باوجود سنائیؒ کا تسنن ہر طرح کے شبہہ سے پاک ہے، ان کا دیوان خلفائے اربعہؓ کی مدح سے پُر ہے اور ان کا نام اسی ترتیب سے لیا گیا جو سلف صالحین میں رائج تھا، حدیقہ کا پانچواں باب فضائل اصحاب النبی کے عنوان سے ہے، اس میں سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ کا، پھر حضرت عمرؓ کا، پھر حضرت عثمانؓ کا اور آخر میں حضرت علیؓ کا ذکر ہوا ہے، ہر ایک کے ذیل کے چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں:

کرامۃ النبوۃ

ہر کجا او شرابِ دیں پالود ... پسر بو قحافہ تحفش بود

بود خود را رسول پیش از بیک ... صدقِ صدیق را سلام علیک

جانِ او بادلش بعلیین ... تنِ او با تنش رفیق و قرین

باب الرابع فی فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ عنہم اجمعین

فضیلت امیر المومنین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

آفتابِ کرم چو در در بست ... قمر نایبانش بو بکر است

چوں نہفت آفتابِ دیں ماغرب ... کرد ماہِ خلافت آخر حرب

بودہ از پاشنہ طریقت سائے ... پیش جان رسول مار افسائے

ہمہ خویش کرد در کارش ... ہمہ او گشتہ بہر دیدارش

بودہ با ذاتِ عشق پر دردش ... ہم رہ و ہم مزاج و ہم دردش

صدقِ او از پے سلامتِ راہ ... بودہ ساحر شناس و کاہن کاہ

بردہ بر شہ رہِ امانت صدق ... قدمِ صدق را بمقعدِ صدق

بر فشاندہ بعشق عقلِ نوے ... بر قدومِ رکابِ مصطفوی

در مشورت وزیرِ پیغامبر ... روز خلوت دبیر پیغامبر

قابلِ صدق و قابلِ ایماں ... عاقلِ علم و حاملِ قرآں

در سرائے سریر مونس و یار ... ثانی اثنین اذ ہما فی الغار

صور صدر قیامتش خواند ... رافضی قدر او کجا داند

اے ندانستہ صدق بوبکری ... تو چہ دانی صلاح بے بکری

رافضی را محل آں نبود ... وانچہ او ظن برد چناں نبود

آنکہ جاں بہر خانداں خواہد ... کے علی را بجاں زیاں خواہد

آنکہ نستد ز حق جلالِ فلک — کے بخود رہ دہد حرام فدک

گر نہ جانش اضافتے بودی — ورنہ صد تش خلافتے بودی

مصطفیٰؐ کے بدو سپردی ملک — یا ز حیدر چگونہ بردی ملک

علیؓ کو کشد ز دشمن پوست — با چنیں دشمنے نباشد دوست

تو بدیں ترہات و ہزل و فضول — مر علی را ہمی کنی معزول

گر ہدا بسن بود روا نہ بود — بخلافت تنش سزا نہ بود

در بود عاجز و خبیر بود — پس منافق بود نہ میر بود

مصلحت بود آنچہ کرد علیؓ — تو چرا سالہا و ماہ درجدلی

مکر و کبر و ہوا بہ دل انداز — تا دہد جانش مر ترا آواز

زیں بد و نیک بہ گزیں کردن — زشت باشد حدیثِ دیں کردن

رافضی را بماندہ در گردن — جیجک و مرگ و جسک و جاں کردن

بر براتے کہ مصطفیٰؐ پرورد — رافضی را یقیں چہ داند کرد

بود بوبکرؓ با علیؓ ہمراہ — تو زبانِ فضول کن کوتاہ

آفرین خدائے بے ہمتا — بر ابوبکرؓ باد و شیرِ خداؓ

صورتِ صدق از دریچۂ فضل — دیدہ فاروقؓ را بعلم و بعدل

بود عدلِ عمرؓ ز بے بکری — آینہ روے صدق بو بکری

کان ز اسلام و ایں ز ایماں بود — عدلِ او عقل و صدقِ ایں جاں بود

دیں بوقت عتیق بود بلال — پس بفاروق یافت عز و جلال

فضیلت امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

آنکہ طٰہٰ طہارتش دادہ — و آنکہ یٰسین امارتش دادہ

شاہد حق روانش در خفتن — نائبِ حق زبانش در گفتن

کردہ بہرِ رسول یزدانش — حسبک اللہ ردیفِ ایمانش

دیدہ دین و ملک باغ از وے — باغِ فردوس را چراغ از وے

از پے مومناں بہ تیغ و کمند — خار شبہت ز راہِ ایماں کند

امر حق درّہ دادہ در دستش — روح کردہ ز راہ سرکشش

درّہ را برائے مستوری — نزدہ درّہ جز بدستوری

خانۂ می خراب گشتہ ازو — زہرۂ زہرہ آب گشتہ ازو

سعدؓ وقاص و عمرو معدی را — آں دو آزادہ و دو ہادی را

بعجم بہرِ دیں فرستاد او — بدل ظلم داد بنہاد او

در نہادند چوں قوی شد حرب — کفر و اسلام در شدند بضرب

در پسِ کوہ کرد ناگاہے — لشکر کافراں کمیں گاہے

او بنورے کہ داشت در رہِ درد — خدعۂ دشمناں بجائے آورد

ایں کمیں گاہ را بدید از دور — بفراست از آں دلِ پُر نور

روز آدینہ بر سر منبر — گفت یا ساریہ ز خصم حذر

الجبل الجبل کہ لشکرِ کفر — حیلہ کردست حملہ بر درِ کفر

سعدؓ وقاص لفظِ او بشنید — و آں کمیں گاہِ اہلِ کفر بدید

کوہ بشگافت و آں ہمہ آواز — بشنیدند و فاش گشت آں راز

کافراں زاں سبب شکستہ شدند — ہمہ حیراں و زار و خستہ شدند

بعمرؓ گشت عمر ملک دراز	بعمرؓ شد در شریعت باز
ملک را در امان و در ایمان	بوده فرزند عدل او عثمان

فضیلت امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

آنکہ بر جائے مصطفےٰؐ بنشست | بر لبش شرم راہ خطبہ بہ بست
آں زلکنت نبود بود از شرم | زانکہ دانست جانش را آزرم
عین ایماں کہ بود جز عثمانؓ | حجت ایں کہ الحیاء من الایمان
شرم او را خداے کردہ قبول | شدہ خوشنود از و خدا و رسول
علم تنزیل مرد را حاصل | دلِ او سرِ وحی را محمل
بدل وعدہ سرو آزادش | بدو چشم و چراغ دامادش
کردہ در راہِ ملک و ملت و ملک | دُرِ قرآں کشیدہ اندر سلک

فضیلت امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

اے سنائی بقوتِ ایماں | مدحِ حیدرؓ بگو پس از عثمانؓ
آں ز فضل آفت سرائے فضول | آں علم دار و علم دار رسول
آں فدی کردہ در رہِ تسلیم | ہم پدر ہم پسر چو ابراہیمؑ
آنکہ در شرع تاجِ دیں او بود | آنکہ تاراج کفر و کیں او بود
آلِ لیٰسیں شرف بدو دیدہ | ایزد او را بعلم بگزیدہ
سرِ قرآن پاک خواندہ بدل | علمِ کونین مرد را حاصل
ہم نبی را وصی و ہم داماد | چشمِ پیغمبر از جانش شاد
مصطفےٰ را مطیع و فرماں بر | ہمہ بشنیدہ رمز او یکسر

رازدارِ خدائے پیغمبرؐ | رازدارِ پیامبرش حیدرؓ
شرف ملک و مایۂ دینِ او | صدفِ دُرِ آلِ یٰسیں او
محرم او بودہ کعبۂ جاں را | محرم او بودہ سرِ قرآں را
کاتبِ نقش نامۂ تنزیل | خازنِ گنجِ خانۂ تاویل
کردہ خصمانِ او چہ بندہ چہ حُر | مطبخ اینجا و دوزخ آنجا پُر
آں مردان و آں سفلہ زیاد | کہ نزنند جز براہ عناد
ہرکہ باشد خوارج و ملعون | واجب است کش بریزی خون

(باقی)

دار المصنفین اعظم گڈھ کی ادبی خدمات

دار المصنفین (شبلی اکاڈیمی) کو اپنے شاندار علمی کارناموں کی وجہ سے بہت جلد عالمگیر شہرت حاصل ہو گئی اور اس کا آوازہ ہندوستان کے حدود سے گذر کر ایشیا کے دوسرے ملکوں اور یورپ و امریکہ تک پہونچ گیا لیکن اب تک خود ستائی کے احساس کی بنا پر قدر دانوں کے اصرار و تقاضا کے باوجود اس کے خدمت گذاروں نے اس کی کوئی مبسوط تاریخ لکھ کر نہیں پیش کی، اس کمی کو ڈاکٹر خورشید نعمانی نے جو دار المصنفین سے بڑا تعلق رکھتے ہیں اور جن کی تمام تر تعلیم و تربیت دار المصنفین کے ماحول ہی میں ہوئی ہے، دار المصنفین کی ادبی خدمات پر ایک مبسوط مقالہ لکھ کر پورا کیا ہے جس پر ان کو بمبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے، یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، مقالہ نگار کا اصل مقصد تو دار المصنفین کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالنا تھا لیکن ضمناً اس میں دار المصنفین کی اس کے آغاز ۱۹۱۴ء سے لے کر سنہ ۔۔ء تک کی مجمل تاریخ بھی آگئی ہے، کتاب بہت محققانہ، دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔ قیمت ۲۰ روپے۔

نیجر

مطالعۂ ملفوظاتِ خواجگانِ چشت کے مبادیات

(خواجگانِ چشت کے ملفوظات کی روشنی میں)

از

مولانا اخلاق حسین دہلوی بستی نظام الدین دہلی

(۴)

خیر المجالس کے بیانات خیر المجالس کے جامع مولانا حمید الدین قلندرؒ ہیں، جو شیخ برہانُ الدّین غریبؒ کے ملفوظات کے بھی جامع ہیں، خیر المجالس کی زبان شُستہ و رفتہ ہے، البتہ اقل قلیل کہیں کہیں بیان میں گنجلک اور بے ربطی ہے، ایسا لگتا ہے کہ کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند ہے اگر وہ بیان اُن ہی کا ہے، تو محلِ استعجاب ہے، ورنہ مجموعی طور پر کتاب دلچسپ ہے،

(۱) گیارہویں مجلس میں ہے کہ کسی شخص نے مخدوم نصیر الدّین چراغ دہلیؒ سے حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے ایک ملفوظ کے متعلق دریافت کیا، (جس کا ذکر آیندہ آئے گا،) تو آپ نے فرمایا،

ایں ملفوظ ایشاں نیست، ایں	یہ ملفوظ ان کا نہیں ہے، یہ
نسخہ ہا بر من ہم رسیدہ است و دراں	نسخے مجھے بھی پہنچے ہیں، اور اُن میں
بسیار الفاظ است، کہ مناسب اقوال	بہت سے لفظ ہیں، کہ جو اُن کے اقوال
ایشاں نیست (خیر المجالس ص ۵۲)	کے مطابق نہیں ہیں۔

اس بیان میں مجموعۂ ملفوظات کے وجود سے انکار نہیں ہے، البتہ تحریف و الحاق کی نشان دہی ہے، جو امکانی ہے، اس بیان میں حرف عطف بھی بلا ضرورت ہے، غالباً اس بیان کی روشنی میں مولانا حامد جمالی (المتوفی ۹۴۲ھ) نے لکھا ہے، :-

نقل است از حمید قلندر کاتب ملفوظ	کتاب خیر المجالس کے کاتب حمید
خیر المجالس ...... فرمودند	قلندر سے نقل ہے، ....
کہ ایں نسخہ ہا بر من رسیدہ اند کاشکہ	انھوں نے فرمایا کہ یہ نسخے مجھے پہنچے
از ایشاں نباشد، در آں جا بسیار	ہیں، جو ہرگز اُن کے نہیں ہیں (کیونکہ)
کلمات مجاوراں و معتقداں با دروغ	اُن میں بہت سے کلمات مجاوروں
نوشتہ اند کہ ہرگز موافق احوال و	اور معتقدوں نے جان بوجھ کر
اعمالِ ایشاں نیست،	لکھ دیے ہیں، جو ہرگز اُن کے اقوال
(سیر العارفین ص ۹۵)	و اعمال کے مطابق نہیں ہیں،

مولانا حامد جمالیؒ نے اگرچہ بات کو بڑھا دیا ہے، اور معتقدوں اور مجاوروں کو الحاق و تحریف سے متہم گردانا ہے، جو مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے بیان میں نہیں ہے، اگر قرین قیاس ہے، تاہم اُن کے بیان میں بھی مجموعۂ ملفوظات کے وجود سے انکار نہیں ہے مولانا حامد جمالیؒ کے بیان کی یہ بھی خصوصیت ہے، کہ وہ بے جان اشیاء کی جمع کے لئے فعل جمع لاتے ہیں، جو خلاف فصاحت اور مولانا حمید قلندرؒ کی روش سے ممیز ہے،

سوال کا جواب تو ختم ہو چکا ہے، تشنۂ تکمیل نہیں ہے، لیکن بعد ازاں کے بعد یہ لکھا ملتا ہے،

فرمودند کہ خدمت شیخ نظام الدینؒ	انھوں نے فرمایا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ

"می فرمود کہ من ہیچ کتابے نہ نوشتہ ام
زیرا کہ خدمتِ شیخ الاسلام فرید الدین
و شیخ الاسلام قطب الدین و خواجگانِ
چشت قدس اللہ ارواحھم و از مشائخِ
شجرۂ ما ہیچ شیخے تصنیف نہ کردہ اند"
(خیر المجالس ص ۵۲)

نے فرمایا ہے کہ میں نے کوئی کتاب
نہیں لکھی ہے، اس لئے کہ شیخ الاسلام
قطب الدین نے اور خواجگانِ چشت
قدس اللہ ارواحھم نے، اور ہمارے
شجرے کے مشائخ میں سے کسی شیخ
نے تصنیف نہیں کی ہے،

اس بیان کا آخری جملہ "از مشائخ شجرۂ ما الخ" میرے ذوق پر گراں گزرتا تھا جو حشو قبیح ہے، حاشیہ کتاب مذکور دیکھنے سے پتہ چلا کہ معلومہ ایک قدیم نسخے میں یہ جملہ نہیں ہے، اس سے خیال کو تقویت اور ذوق کو طمانیت ہوئی، اور یہ بات کھل گئی کہ یہ جملہ بیان کی تقویت کے لئے بعد میں اضافہ کیا گیا ہے، جس نے بیان کو گنجلک اور مشتبہ کر دیا ہے، اور جو حشوِ قبیح ہے،

وہ جملہ جو حضرت محبوبِ الہیؒ سے منقول اور بیان کے آغاز میں ہے، فوائد الفواد (ص ۵۴) میں بھی ہے، جس کے فعل "نہ نوشتہ ام" کی وضاحت کی جا چکی ہے، کہ اس سے مراد مخصوص کتاب سے انکار ہے، جملہ تحریرات سے انکار نہیں ہے، اسے کسی اور تحریر کے لئے بنیاد بنانا، اور نوشتہ کے مفہوم کو تصنیف کے لئے مخصوص گردانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ کسی بیان سے وہ معنی مراد لینے جو قائل کا مدعا نہیں، تفننِ طبع کے بطور تو بیشک روا ہے، دانش کی گنجایش کہاں ہے، پھر اسے عبارتِ مابعد کے لئے دلیل بنانا اور عبارتِ مابعد کو جملہ مذکورہ سے مربوط ظاہر کرنا جو فوائد الفواد میں بھی نہیں ہے، ہرگز صحیح نہیں ہے، یہ عبارت جو گوناگوں معائب سے ہم آغوش ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا حمید قلندرؒ جیسے شائستہ نہاد

اہلِ قلم کے قلم سے نکلی ہے یا نکل سکتی ہے، یا مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی فرمودہ ہو سکتی ہے، جو متضاد ہے، اور ادبی اسقام کی حامل ہے،

یہ دونوں بیان باہم متضاد ہیں، پہلے بیان میں ہے

"دراں بسیار الفاظ است کہ مناسبِ اقوالِ ایشاں نیست"

دراں بسیار الخ سے کوئی نسخہ جعلی نہیں قرار پا سکتا، نہ کسی کے وجود سے انکار مانا جا سکتا ہے، مگر دوسرے میں صریحاً انکار ہے، لطیفہ یہ ہے کہ مضمون ملفوظات سے متعلق ہے، مگر انکار ہے تصنیف سے، یہ نثر نگار کیا اتنا بھی نہیں جانتا کہ مجموعۂ ملفوظات میں اور تصنیف میں زمین آسمان کا فرق ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ اس بیان کا تعلق محض تصنیف سے ہے تو بھی تسلیم کرنے کی بے تکلف ہی گنجایش نکلے گی، کیونکہ معتبر ماخذات میں خواجہ حسن بصریؒ کی تفسیر اور رسالہ ابراہیمؒ کا، اور رسالہ شیخ علو دینوریؒ کا ذکر ملتا ہے، اگر یہ روش ناپسندیدہ ہوتی، تو شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی تصنیفات کا ذکر کیوں ملتا،

اگر کتب ملفوظات کے وجود سے انکار ہی مقصود تھا تو ایک کے بعد دوسرے بیان کی، اور "دراں بسیار الفاظ الخ" کے کھڑاگ میں پھنسنے کی ضرورت ہی کیا تھی، ایک ہی جملے میں کام تمام تھا، کہہ دیا ہوتا کہ "کتب ملفوظات کہ از مشائخ ما منسوب کردہ اند، از ایشاں نیست" نہ تو حضرت محبوبِ الہیؒ کے بیان کو دلیل بنانے کی ضرورت تھی، اور از مشائخ شجرۂ ما کا بدنما پیوند لگانے کی ضرورت تھی، نہ بے امتیازی سے مجموعۂ ملفوظات کو تصنیف کہنے کی ضرورت تھی، جو عجزِ معلومات کا بدنما داغ ہے، یہ کھڑاگ غماز ہے کسی اور ہی کارستانی کا، ع

شب کی خبر دیتی ہے آنکھ شرمائی ہوئی

اس بیان کو میرے نزدیک مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے منسوب سمجھنا یا منسوب بتانا نافہمی کی علامت ہے، مولانا حمید قلندرؒ کو بھی متہم نہیں کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اُن کی کتاب میں عموماً یہ گنجلک اور ناہمواری نہیں ہے، حضرت مخدومؒ کو صاف دلی سے جو بات کہنی تھی، کہہ دی تھی کہ دراں بسیار الفاظ است الخ اُن کے بیان سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کتبِ ملفوظات کے وہ کتب ملفوظات کے وجود کے قائل نہ تھے،

مشائخ چشت رحمہم اللہ کی کتب ملفوظات سے انکار متقدمین سے ہرگز بھی ثابت نہیں، بلکہ اس کے برعکس اقرار ثابت ہے،

مشائخِ چشت کی کتب ملفوظات سے انکار ہرگز قرین قیاس نہیں اور جعلی بتانا کھلی نادانی ہے، اگر یہ کوئی حقیقت ہوتی تو شمائل الاتقیاء جو شیخ برہان الدین غریبؒ کے ایماء سے تصنیف ہوئی، اس کی فہرست ماخذات میں ان میں سے اکثر کا ذکر کیوں ہوتا۔ شیخ برہان الدین غریبؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کے بزرگ خلفاء میں سے تھے، جن کی عمر کا طویل زمانہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت و صحبت میں گذرا تھا، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ بھی انھیں عزیز و محترم جانتے تھے ان کی وفات کے بعد تا دم آخر ان کا عرس کرتے رہے، وہ اپنے شیخ کے نظریات سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کتب ملفوظات جعلی ہوتیں تو ہرگز ان سے منسوب کرنا گوارا نہ کرتے۔

امیر خورد کرمانیؒ نے اسی خوشگوار روحانی ماحول میں پرورش پائی تھی، اگر اس عہد میں کتبِ ملفوظات کو جعلی یا مشتبہ خیال کیا جاتا تو بعض ملفوظات کا ذکر ان کے زبان قلم پر کیوں آتا۔ اسی عہد میں مخدوم نصیر الدینؒ چراغ دہلی کے مقتدر مرید مولانا محمد مجیر وجیہ ادیبؒ نے مفتاح العاشقین تصنیف فرمائی، جس میں ملفوظات مشائخِ چشت سے بھی استفادہ کیا ہے، ان کے ماخذات میں خیر المجالس بھی ہے، مفتاح العاشقین کو بنظر اصلاح شیخ کمال الدین علامہؒ نے بھی دیکھا تھا،

اگر خیر المجالس میں یہ انکار درحقیقت بیان ہوتا تو اس سے وہ ضرور متاثر ہوتے اور اپنے شیخ کے نظریہ کو ہرگز نظر انداز نہ کرتے، تواتر سے ثابت ہے کہ عہد بہ عہد ثقہ اہل قلم کتب ملفوظات سے استفادہ کرتے رہے ہیں، جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا ابتدائی زمانہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ہی کا تھا، ان کی وفات ۷۸۲ھ میں یعنی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے وصال ۵۷ سال بعد ہوئی، ان کے مجموعۂ ملفوظات "خوانِ پُر نعمت" میں صاف طور پر ذکر ہے کہ شیخ عثمان ہارونیؒ کے ملفوظات کو حضرت خواجہ معین الدینؒ نے جمع کیا ہے' (ص ۸۰) اسی طرح ان کے مجموعۂ ملفوظات مُخ المعانی' میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات کے حوالے ہیں (ص ۲۹-۵۱) ان سے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے استفادہ بھی کیا، پھر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مطالعہ میں بھی یہ ملفوظات رہے، انھوں نے واضح طور پر اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ خواجہ بختیار اوشیؒ نے حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہٗ کے ملفوظات جمع کئے[1]، (ص ۲۲-۲۵) اور حضرت گنج شکرؒ کے ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے مکتوب کئے[2]، (ص ۵۲)

(معارف اعظم گڈھ مارچ ۱۹۷۹ء)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مطالعہ میں بھی خیر المجالس تھی، انھوں نے تین صفحے سے زیادہ اس سے استفادہ کیا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی بھی خیر المجالس کے مذکورہ بیان سے متاثر نہیں، نیز مشائخ چشت کی

---

[1] در دلیل العارفین کہ خواجہ قطب الدین بختیار اوشی از ملفوظات خواجہ قدس سرہٗ جمع کردہ [2] بعضے از ملفوظات گنج شکر کہ بخط شیخ نظام الدین اولیاءؒ یافتہ اند مکتوب می گردد ــ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے بھی جمع کئے تھے، دے را رسالہ ایست مسمی اسرار الاولیاء کہ درو سے ملفوظات گنج شکرؒ را جمع کردہ (اخبار الاخیار ص ۶۷)

کتبِ ملفوظات سے متواتر آج تک استفادہ کیا جا رہا ہے، اور کوئی بھی جعلی مان کر انھیں نظر انداز نہیں کرتا، دراں حالیکہ مذکورہ بیان کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب اور مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے منقول بتایا گیا ہے، پھر بے اعتنائی کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ دو باتوں میں سے ایک بات ماننی ہوگی، یا تو یہ بیان خیر المجالس کے قدیم نسخوں میں نہیں ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے، یا اگر ہے تو جیسا بتایا جا چکا ہے کہ یہ وہ اونٹ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں، ثقہ اہل قلم نے اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور نظر انداز فرماتے رہے، اگر ایسا کیا ہے تو یہ ان کی نکتہ دانی اور بصیرت باطنی کی دلیل ہے البتہ چودھویں صدی کے تنقید نگاروں کو یہ شگوفہ ہاتھ لگا ہے،

بہر حال خیر المجالس کی زیر بحث عبارت ہرگز لائقِ اعتنا نہیں اور اس کے پیش نظر مشایخ چشت رحمہم اللہ تعالیٰ کی کتب ملفوظات کو جعلی قرار دینا درست نہیں۔

جعلی کے واہمہ کو ذہن نشین کرانا اس واہمہ کو کہ کتب ملفوظات جعلی ہیں، ذہن نشین کرانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی ہے، فوائد الفواد ہی کے بیان کو جس کا ایک جملہ اس سے پہلے بیان میں نقل ہو چکا ہے مسخ شدہ صورت میں دہرایا اور لکھا ہے:

بندہ عرض داشت کرد کہ در فوائد الفواد آمدہ است کہ شخصے بخدمت شیخ الاسلام شیخ نظام الدین قدس اللہ سرہ العزیز عرض داشت کرد کہ من بر شخصے کتابے دیدہ ام از تصنیف شیخ۔ خدمت شیخ زمودند۔ او تفاوت گفتہ است، من ہیچ کتابے تصنیف نہ کردہ ام، دخواجگان ما نیز نہ کردہ اند، خواجہ سلمہ فرمودند، آرے خدمت شیخ ہیچ کتابے تصنیف نہ کردہ است، باز بندہ عرض داشت کرد کہ ایں نسخہ ہا دریں وقت پیدا شدہ است، ملفوظات شیخ قطب الدینؒ و شیخ عثمان ہارونیؒ در حیات خدمت شیخ نہ بود؟ خواجہ فرمودند، نہ بود۔ اگر بودے خدمت شیخ فرمودے دیدا شدے، (خیر المجالس ص ۵۳)

قطع نظر اس سے کہ فوائد الفواد کے حوالے سے جو عبارت منقول ہے، بعینہ وہ فوائد الفواد میں نہیں ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پہلے ہی بیان میں یہ موجود ہے کہ خواجگان چشت ...... واز مشایخ شجرۂ ما ہیچ شخصے تصنیف نہ کردہ است (ص ۵۲) تو اس سے تسلی کیوں نہیں ہوئی، کیا خامی رہ گئی تھی جس کو رفع کرنے کے لئے مکرر دریافت کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی؟ ہے کوئی جو یہ کہہ سکے کہ یہ سات سطری بیان تحصیل حاصل نہیں ہے جس سے کتاب کا اعتبار مجروح ہوتا ہے، یہی دلیل ہے اور روشن دلیل ہے کہ جعلی کے واہمہ کو تقویت دینے اور ذہن نشین کرانے کی بے جا کوشش کی گئی ہے، جس نے حقیقت کے چہرے سے نقاب الٹ دیا ہے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ جو عبارت اس بیان میں فوائد الفواد کے حوالہ سے نقل ہے وہ بعینہٖ فوائد الفواد کی عبارت نہیں ہے، بلکہ مسخ شدہ ہے، اَنمِل، بے جوڑ اور اغلاط کی دلدل ہے، جس کا تجزیہ مناسب ہوگا۔

متکلم کا بیان ہے "من بر شخصے کتابے دیدہ ام از تصنیف شیخ" متکلم نے کہیں کسی کے پاس کتاب دیکھی، غالباً اسی مماثلت سے اس کو شبہہ ہوا اور وہ سمجھا کہ یہ شیخ کی تصنیف ہے، یہ رائے دیکھنے والے نے خود قائم کی ہے، یہ بات اسے کسی نے سکھائی یا بتائی نہیں ہے کہ یہ شیخ کی تصنیف ہے، اس جزو کے متعلق اتنا ہی ذہن نشین رکھنا کافی ہے۔

جملہ کا آخری حصہ ہے "از تصنیف شیخ" یہ مبہم ہے، لفظ شیخ وضاحت چاہتا ہے کہ شیخ سے مراد کون بزرگ ہیں، یہ جملہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے روبرو بولا گیا ہے، قرینہ یہ بتاتا ہے کہ شیخ سے مراد متکلم کی حضرت محبوب الٰہیؒ ہیں، محل گفتگو اور آداب مجلس کا اقتضا یہ ہے کہ شیخ کے ساتھ تعظیمی الفاظ کا اضافہ بھی ہوتا، تاکہ دلالت تشنۂ تکمیل نہ رہتی، خصوصاً اس لئے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی مجلس وہ مجلس تھی جہاں اچھے اچھے باکمال عجز و نیاز سے سر بہ خم رہتے تھے، صرف شیخ کہنا اور حضرت

محبوب الٰہیؒ کے روبرو کہنا ہرگز مقتضائے حال کے مطابق نہیں ہے۔

اس کے بعد اس بیان کا جواب ہے، جو حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبانی نقل کیا ہے، یہ بھی فوائد الفواد کی مسخ شدہ عبارت ہے، جس میں ایک جملہ کا اضافہ بھی ہے، یہ عبارت اغلاط سے پُر، بے محل، اور کسی ایسے شخص کی مسخ کردہ ہے جو بالکل ہی مبتدی ہے، بلکہ مبتدی سے بھی گیا گذرا ہے، جو ہرگز مذکورہ بیان کا جواب نہیں، اسے بطور جواب کے حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کرنا درست نہیں ہے، وہ مبتدی جسے فارسی میں ذرا بھی شُدبُد ہے، وہ بھی مذکورہ بیان کا یہ جواب نہیں دے سکتا، جو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کر دکھایا ہے جو عالم و عارف زبان دان و اہل زبان اور برگزیدہ و عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ جواب یہ ہے:

"او تفاوت گفتہ است، من ہیچ کتابے تصنیف نکردہ ام، و خواجگانِ ما نیز نکردہ اند۔"

متکلم مخاطب و موجود ہے، پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ "او تفاوت گفتہ است" فعل بھی بصیغۂ غائب اور ضمیر بھی بصیغۂ غائب، متکلم نے جو کچھ کہا ہے اپنے صوابدید سے کہا ہے، اس سے کسی نے کچھ کہا سنا نہیں ہے، ضمیر و فعل دونوں بصیغۂ حاضر ہونے چاہئیں، افعال و ضمائر کی ایسی غلطیاں تو مبتدیوں سے بھی کم ہی ہوتی ہیں، چہ جائیکہ کسی پڑھے لکھے سے صادر ہوں، حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے تو کچھ اس طرح فرماتے:

"تفاوت دیدہ" ۔ "تفاوت می گوئی"

بلاشبہ بہ تفاوت کثیرہ بعض جملے فوائد الفواد سے منقول ہیں، ناقل پہلے جملے کے محل استعمال سے ناواقف ہے، دوسرے جملے میں نہ نوشتہ ام کو تصنیف نہ کردہ ام کر دیا ہے، تیسرے جملے کا اضافہ کیا ہے، جو حشو قبیح ہے بلکہ افترا ہے، یہ ہے وہ ساری کائنات جو کتب ملفوظات کو جعلی بتانے کی بنیاد ہے، مولانا حمید قلندرؒ سے تو یہ ہرگز توقع نہیں کہ وہ یہ بے سرو پا عبارت لکھتے۔

کہنے والا یہ کہتا ہے کہ میں نے دیکھی ہے، جواب دینے والا کہتا ہے کہ وہ غلط کہتا ہے، یہ کیسا منطق ہے، کہنا تھا: تم نے غلط کہا ہے۔ ان دانشوروں پر جو اس بے ربط عبارت کو بنیاد بنا کر کتبِ ملفوظات کو جعلی بتا رہے ہیں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا یہ فرمانا بجا ہے:

"یہ وہ لوگ ہیں جو ہماری مذہبی، روحانی اور ثقافتی وراثت کا تمسخر کر کے ہم کو اپنے ماضی کی عظمت سے بے گانہ کرنا چاہتے ہیں۔"

(معارف، اعظم گڈھ، ص ۳۶۳، ۳۶۴ مئی ۱۹۷۹ء)

تاکہ خالی الذہن ہو کے مادی قدروں کو آسانی سے قبول کر لیا جائے، جو قومیں تنزل کے گڑھے میں گرنے لگتی ہیں، یا گر چکی ہوتی ہیں، ان کے اسلاف کو اسی طرح ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے۔

تراجم کی کیفیت مشایخ چشتؒ کے ملفوظات کے جو تراجم دستیاب ہوتے ہیں، وہ فارسی متن سے بھی زیادہ مخدوش اور غلط ہیں، وہ روایت جو حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کے مجموعۂ ملفوظات میں ہے، وہ متن میں کس طرح ہے اور ترجمے میں اس کا کیا رنگ روپ ہے، دیکھنے کے لائق ہے، فارسی متن میں ہے:

فارسی متن	ترجمہ
عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت	عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اللہ صلی اللہ
کرد از رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہر کہ	علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جو چالیس
چہل مادہ گاؤ بسمل کند خون یک گناہ	گائیں زخمی یا ذبح کرتا ہے تو اس کے
در نامۂ اعمال او بنویسند، و ہر کہ دہ	نامۂ اعمال میں ایک خون کا گناہ لکھتے ہیں
گوسفند بسمل کند یک خون بنامِ او بنویسند	اور جو دس بھیڑیں زخمی یا ذبح کرتا ہے
ہر کہ جانورے را بہوائے نفس بسمل کند	اس کے نام ایک خون لکھتے ہیں، جو کوئی

ہمچناں باشد کہ ویراں کردن خانۂ کعبہ	کسی ایک جانور کو نفسانی خواہش سے
یاری کردہ باشد، مگر بہ مجلسے کہ دراں روا	زخمی یا ذبح کرتا ہے، وہ ایسا ہے کہ اس نے
باشد۔	خانۂ کعبہ کو ویران کرنے میں مدد کی ہے
(انیس الارواح، ص ۲۷)	مگر جس کسی مجلس میں روا ہے (رواہے)

اس روایت میں 'خونِ یک گناہ' کی ترکیب محلِ نظر ہے، گناہِ یک خون مناسب ہوتی۔

یہ روایت بطور حدیث مروی ہے، صوفیاے کرام کا حدیث کے باب میں مسلک یہ ہے کہ حالت اطلاق میں رہنے دیا جائے، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے:

حدیثے کہ مردم بشنوند نتواں گفت کہ	جو حدیث سنیں تو یہ نہ کہنا چاہئے کہ یہ
ایں حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث
نیست، اما، ایں تواں گفت کہ در کتبے	نہیں ہے، مگر یہ کہہ سکتا ہے کہ جن کتابوں
کہ ایں احادیث جمع کردہ اند واعتبار	میں انھوں نے (محدثین نے) حدیثیں
یافتہ اند، نیامدہ است۔	جمع کی ہیں، اور وہ معتبر مانی گئی ہیں،
(فوائد الفواد ص ۲۳۳)	(ان میں یہ حدیث) نہیں آئی ہے۔

لہٰذا اس حدیث کو حالت اطلاق میں رہنے دیا جائے گا، البتہ یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس مجموعۂ ملفوظات میں صحت کے ساتھ نقل نہ ہو سکی ہو، اس روایت کا ترجمہ مولوی غلام احمد بریاں مرحوم نے یہ کیا ہے:

عبداللہ ابن مسعودؓ نے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جو شخص چالیس [40] گایوں کو ذبح کرے، ایک خون اس کے نام لکھا جاتا ہے اور جو شخص سو [100] بکریاں ذبح کرے اس کے نام بھی ایک خون تحریر کرتے ہیں اور جو شخص جانور کو ہوائے نفس سے ذبح کرتا ہے، اس کا حال ایسا ہے جیسا کہ اس نے خانۂ کعبہ کے ڈھانے میں مدد کی، مگر ان کا ذبح کرنا اس محل میں روا ہے جہاں ان کا ذبح کرنا درست ہے۔ (مجموعۂ ملفوظات خواجگان چشت ترجمہ انیس الارواح ص ۳۰)

'خونِ یک گناہ' کا ترجمہ 'ایک خون' کیا ہے، 'نامۂ اعمال' کا ذکر ہی نہیں، 'دَہ' (دس) بھیڑوں کا ترجمہ 'سو [100]' (صد) بکریاں کیا ہے، بھیڑ بکری میں باعتبار لغت مضایقہ نہیں، 'بھی' کا اضافہ ہے، 'جانورے' کی یاے وحدانی یا تنکیری کا ترجمہ محذوف ہے، ویران کا ترجمہ ڈھانے کیا ہے، ویران لغت میں اجاڑ اور غیر آباد کو کہتے ہیں، ڈھانے کو نہیں کہتے، متن میں 'مجلسے' ہے، جو غالباً کاتب کا سہو ہے، اس کا ترجمہ 'محل' قرین قیاس ہے، اصل اور ترجمہ میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے، اسی روایت کا ذکر بقول مولانا حمید قلندر مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی مجلس میں آیا تھا اور اس طرح آیا تھا:

ایشاں (خواجہ عثمان ہرونیؒ) فرمودہ اند کہ	انھوں نے (خواجہ عثمان ہرونیؒ نے) فرمایا کہ
دو [2] مادہ گاؤ ذبح کند یک خون کردہ باشد،	جو کوئی دو [2] گائیں ذبح کرے اس نے
وہر کہ چہار مادہ گاؤ ذبح کند دو خون کردہ	ایک خون کیا اور جو چار گائیں ذبح کرے
باشد، وہر کہ دَہ گوسفند ذبح کند یک خون کردہ	اس نے دو خون کیے، جو دس بھیڑیں
باشد، وہر کہ بست [20] گوسفند ذبح کند دو خون	ذبح کرے اس نے ایک خون کیا، جو بیس [20]
کردہ باشد (خیر المجالس ص ۵۲)	بھیڑیں ذبح کرے اس نے دو خون کیے

انیس الارواح میں چہل مادہ گاؤ ہے، خیر المجالس میں دو [2] مادہ گاؤ ہے، زمین آسمان کا فرق ہے، لطف یہ ہے جو صلہ چالیس [40] کا ہے وہی دو [2] کا ہے، پھر دوگنی تعداد بیان کی ہے، اسی کے مطابق صلہ بتایا ہے، اس کی ضرورت کیا تھی، البتہ دَہ [10] گوسفند بدستور ہے، بریاں کی طرح سو [100] (صد) نہیں بنایا، مگر دوگنی تعداد اس کی بھی بیان کی ہے، جو بالکل بے مصرف ہے، میں حیران ہوں کہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی جناب میں ایسی گفتگو بھی ہوتی تھی، پھر مولانا حمید قلندرؒ جو اچھے انشا پرداز تھے انھوں نے

کیسے گوارا کر لیا، اور جوں کا توں نقل کر دیا، جو بیان کا بھی نقص ہے اور انشاء کا بھی، البتہ یہ ممکن ہے کہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی جناب میں نہ یہ ذکر آیا ہو اور نہ مولانا حمید قلندرؒ نے اسے قلمبند کیا ہو اور یہ کسی اور ہی کی کارستانی ہو۔

خیر المجالس کی روایت از اول تا آخر ناتمام ہے، یہ ذکر ہی نہیں کہ بطور حدیث اسے ذکر کیا ہے، ورنہ ممکن تھا حضرت مخدومؒ کا جواب کچھ اور ہوتا اور بصیرت افروز ہوتا، اس سے تو یہ بیان مشتبہ ہو جاتا ہے کہ "ایں نسخہ ہا برمن رسیدہ است"، اگر یہ صحیح ہے تو جواب ایسا ہوتا جس سے پوری روایت متاثر ہوتی، البتہ جس طرح بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ "ایں ملفوظِ ایشاں نیست"، کچھ بھی سہی یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خیر المجالس کی یہ روایت مخدوش ہے، واقعہ کی صحیح عکاسی نہیں ہے، اور خواجہ عثمان ہارونیؒ سے مطلقاً منسوب بنانا دروغ بیانی ہے، خیر المجالس کے مترجم مولوی احمد علی ٹونکی مرحوم نے یہ ترجمہ کیا ہے:

> ایک عزیز نے اہلِ محفل سے عرض کی کہ ملفوظ حضرت خواجہ عثمان ہارونی قدس اللہ سرہ العزیز میں لکھا ہوا ہے کہ درویشوں کا مقولہ ہے کہ جو دو گائے ذبح کرے اس نے گویا دو خون کیے، جو چار ذبح کرے، گویا چار خون کیے اور جو چار گوسفند ذبح کرے اس نے گویا ایک خون کیا ۔۔۔۔۔
>
> (سراج المجالس ص ۳۵)

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اسی عبارت کا ترجمہ ہے جو خیر المجالس میں ہے، خیر المجالس میں دو گائیں ذبح کرنے کا صلہ ایک خون ہے جو اس ترجمہ میں دو خون ہو گیا ہے، اور چار کے عوض دو خون کی بجائے چار خون ترجمہ فرمایا ہے، خیر المجالس میں دس بھیڑوں کے ذبح کرنے کا صلہ ایک خون ہے، ترجمہ میں چار کے ذبح کرنے کا صلہ ایک خون ہے، فوائد السالکین میں مثل حدیث مروی، خیر المجالس میں خواجہ عثمان ہارونیؒ کا مقولہ نہیں، مترجم نے درویشوں کا مقولہ بتایا ہے، غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

اس ایک ہی روایت سے ترجمے کی کیفیت آئینہ ہو جاتی ہے، وہ کیسے دانشور ہیں جو ایسے ترجموں کو تنقیدی بنیاد قرار دیتے اور لکھتے ہیں:

> اس وقت میرے سامنے کوئی فارسی متن نہیں ہے، اس مضمون میں جتنے حوالے دیئے گئے ہیں، وہ اس اردو ترجمہ کے ہیں جو "ہشت بہشت" کے نام سے ۱۹۵۶ء میں لاہور سے چھپا تھا ... ... اگر مترجم نے کہیں فارسی متن سے انحراف کیا ہو تو میں فی الوقت اس کی تصحیح سے قاصر ہوں۔
>
> (منادی دہلی ص ۱۶۰، حاشیہ بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶ ۱۹۷۴ء)

> اصل فارسی کتاب میں نے دیکھی ہے، مگر یہ مضمون لکھتے وقت میری دسترس میں نہیں ہے، اگر مترجم نے کہیں ترجمہ میں غلطی کی ہو تو میں اس کی نشاندہی کر قاصر ہوں۔ (منادی دہلی، ص ۱۷۷ (حاشیہ) بابا فرید نمبر جلد ۴۹ ۱۹۷۴ء)

کتب ملفوظات کے فارسی متن کمیاب تو ہیں، مگر نایاب نہیں، لائبریریوں سے بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں، یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کام کرنے میں کتنا وقت لگا، اور کن حالات میں کیا گیا ہے، بلکہ دیکھتے یہ ہیں کہ کیا کیا ہے اور کیسا کیا ہے؟ تنقید نگار لکھتے ہیں:

> جعلی ملفوظات کے تمام ذخیرے کے انداز اور ترتیب میں حیرت انگیز یکسانی پائی جاتی ہے، چنانچہ انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب، اسرار الاولیاء، افضل الفوائد سب کا ایک ساہی انداز ہے۔ (منادی دہلی ص ۱۶۳، بابا فرید نمبر ۱۹۷۴ء)

شاید اردو تراجم کو پڑھ کر انھوں نے یہ رائے قائم کی ہوگی، کہنے کا مدعا یہ ہے کہ تراجم کی حالت فارسی متن سے بھی گئی گزری ہے، تراجم کے مطالعہ سے رائے قائم کرنا ہرگز درست نہیں، اور تراجم کی روشنی میں صحیح اور جائز بھی نہیں کہا جاسکتا۔

وقت کا تقاضا وقت کا تقاضا یہ ہے کہ بزرگانِ دین کے سب ہی عقیدتمند اس ضرورت کو محسوس کریں، اور مل کے بیٹھیں، اور غور کریں کہ ملفوظات کے خلاف جو محاذ قائم کیا جا رہا ہے، یہ کیوں؟ غور و فکر سے بات کی تہ کو پہونچ جائیں گے، اور تدارک کے لئے لائحہ عمل تجویز کر لیا جائے گا، جو بالاتفاق طے ہو، اس پر عمل کیا جائے تو خاطر خواہ یہ فتنہ فرو ہو سکتا ہے۔

ہلکی سی تدبیر یہ ہے کہ قدیم ملفوظات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں فراہم کی جائیں، جو آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں، ان کے باہمی مقابلے سے ان کی تصحیح کی جائے اور انھیں شائع کرایا جائے، اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم بھی شائع کئے جائیں، اردو، ہندی، پنجابی، پوربی، بنگالی، گجراتی، راجستھانی، تامل، تلنگی، مہاراشٹری، غرض کہ ہندوستان کی ہر زبان میں اور انگریزی میں بھی، نہایت استقلال اور حزم و احتیاط سے اور کامل اخلاص سے اس کام کو کیا جائے، اور نشر و اشاعت کی بھی کوشش کی جائے۔

ہر کتاب پر سیر حاصل مقدمہ لکھا جائے اور پوری صحت سے اعتراضات کے جواب دئے جائیں، اور غلط بیانیوں کو سلیقہ سے رفع کیا جائے، اگر کامل استقلال سے کام کیا جائے گا، تو یہ فتنہ رفع ہو جائے گا، اور اچھا معاشرہ رواج پائے گا جو مقصود اصلی ہے ان ملفوظات کا، لیکن اس کے لئے باہمی اتحاد اشد ضروری ہے، مجھے توقع ہے کہ اولیاء اللہ کے عقیدتمند اس ضرورت کو محسوس کریں گے اور اپنے اپنے حلقے میں کام شروع کر دیں گے، پہلا قدم یہی ہے کہ ملفوظات کے فارسی نسخوں کو صحت کے ساتھ شائع کیا جائے، اگر مستعدی سے کام لیا جائے گا تو اشاعت بھی آسان ہو جائے گی، یہ تحریک ہے، جب عمل کا آغاز ہوگا تو جو موانع حائل ہوں گے، رفع ہوتے رہیں گے۔

بہ گام نہ خواہی بیاب۔

راجہ جے سنگھ کی رصدگاہیں

از

جناب شبیر احمد خاں غوری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۲)

جے سنگھ کا مسلم ماخذ

مسلم علم الہیئت سے راجہ جے سنگھ کی اثر پذیری کا مسئلہ

چنانچہ فاضل مصنف (جی۔ آر۔ کے) موکد الفاظ میں اس اثر پذیری کا اعلان کرتا ہے:

"ان عوامل و موثرات کے باب میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے، جنھوں نے اس کی (راجہ جے سنگھ کی) ہیئتی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا، یہ الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کے اثرات تھے[1]"

خود راجہ کو اس کا اعتراف ہے، حالانکہ جس وجہ سے بھی ہو اُس نے ان ہند و جوتش اور یورپی ہیئت کی کتابوں کی جو اس کے مطالعہ میں رہی تھیں، تفصیل نہیں بتائی، مگر مسلم علم الہیئت کے ان شاہکاروں کا جن سے اس نے استفادہ کیا تھا، بڑے فخر و ابتہاج کے ساتھ نام بہ نام

---

[1] G.R. Kaye, Ph. 69

ذکر کیا ہے، چنانچہ کتا بھارے ہندی" اور "زیج فرنگی" سے پہلے وہ مسلم علم الہیئت کے چار شاہکاروں کا نام لیا ہے۔ جو اس زمانہ میں مشہور و متداول "متعارف" تھے:

"زیجہائے متعارف مثل زیج جدید سعید گورگانی و خاقانی و تسہیلات ملا چند اکبر شاہی و ملا فرید شاہجہانی"[1]

مگر فاضل مصنف (جی۔ آر۔ کے) نے جس وجہ سے بھی ہو، ان میں سے صرف پہلے تین کا ذکر کیا ہے اور اس میں بھی افسوسناک تسامح ہوئے ہیں، تفصیل آگے آ رہی ہے،

مسلم (یونانی، عربی) علم الہیئت سے راجہ کے تاثر کے سلسلہ میں فاضل مصنف نے مندرجۂ ذیل ہیئت دانوں کا نام لیا ہے:۔ اقلیدس، ابرخس، بطلیموس، عبدالرحمٰن بن عمر ابوالحسین الصوفی، نصیر الدین طوسی، علی بن محمد السید الشریف، جمشید بن مسعود "جنات" (غیاث الدین؟) الکاشی، الغ بیگ، مولانا چند (چاند)

اقلیدس کی چار کتابیں مشہور تھیں: "اصول الہندسہ والحساب" علم ہندسہ میں اور "کتاب المناظر" "ظاہریات الفلک" اور "کتاب المعطیات" متوسطات میں، اصول الہندسہ والحساب یا اصول اقلیدس کوئی دو ہزار سال تک متمدن دنیا میں ہندسہ کی ادبیاتِ عالیہ میں محسوب ہوتی رہی تھی اور ریاضی و ہندسہ کے فضلاء اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے، خود راجہ کے زمانہ میں درباری طبیب میر محمد ہاشم نے اس کی مبسوط شرح لکھی تھی، راجہ کے ایماء سے سنسکرت زبان میں "چھیتر درس" کے نام سے اس کا ترجمہ کیا گیا تھا، مگر "زیج محمد شاہی" میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس سے تعرض کا کوئی محل بھی نہیں تھا، کتاب المعطیات بھی ہندسہ ہی میں ہے، اس کا بھی محل نہ تھا۔ "ظاہریات الفلک" (Phaeno mena) نہ صرف ہندسہ کی دی ہے

[1] زیج محمد شاہی: ص اب.

بلکہ ریاضیاتی (ہندسی) ہیئت کے اہم مسائل پر بھی مشتمل ہے۔ مگر راجہ نے "زیج محمد شاہی" میں اس سے کہیں تعرض نہیں کیا، "المناظر" بصریات (Optics) میں ہے، مگر راجہ نے ان مسائل سے بھی تعرض نہیں کیا۔

"زیج محمد شاہی" میں جے سنگھ نے اقلیدس کا ذکر صرف دیباچہ میں بطور "براعت استہلال" کیا ہے:۔

"براہین اقلیدس در بیان اشکال صنائع او حرفے ناتمام"[1]

ابرخس (Hepparchus) یونانی علم الہیئت کے آخری اور چوتھے دور "ریاضیاتی علم الہیئت" کا بانی و مفتح ہے، بدقسمتی سے اس کی کوئی تصنیف دستبردِ حوادث سے محفوظ نہ رہ سکی، اس کی دریافتوں تک رسائی کا واحد ذریعہ بطلیموس کی کتاب "المجسطی" ہے، جیسا کہ البیرونی "قانون مسعودی" میں کہتا ہے:

"ولم یقع الینا شیئ من کتب ابرخس یشف به الحال فحد لنا ضرورۃ الی اعمال بطلمیوس لانه تولاها واحتاط فیها"[2]

جے سنگھ نے اجرام سماوی کی حرکت کے سلسلے میں "گردش دوری" (Circular motion) کا انتساب بطلیموس کے ساتھ ساتھ ابرخس کی جانب بھی کیا ہے:۔

"چوں راصدان پیشین مانند ابرخس و بطلیموس مدار تعادیل و اوساط بر شکلہائے فلکی که قرار داد ایشان است داشته اند ... الخ"[3]

لیکن غالباً فاضل مصنف (اور اسی طرح راجہ جے سنگھ کے دوسرے تبصرہ نگاروں) کے پیش نظر

[1] زیج محمد شاہی: ص اب. [2] ابوریحان البیرونی: القانون المسعودی

[3] زیج محمد شاہی: ص ۴۶ ظ.

یہ حوالہ نہ تھا، اس کے سامنے تو دیباچہ کا وہ جملہ تھا جو جے سنگھ نے بطور براعت استہلال،
"اور خس" (بمعنی ناچیز) کی مناسبت سے بطور "صنعت تجنیس ناقص" لکھا ہے:

"از نارسائی غور محیط قدرتش ابر خس خس است برہم زدہ دست افسوس[1]"

بطلیموس کی کتاب المجسطی سے راجہ کے تاثر کا تفصیلی ذکر اوپر آچکا ہے، لیکن فاضل مصنف کے
سامنے "زیج محمد شاہی" کے دیباچہ کا اگلا جملہ تھا:

"و در اندیشہ ارتفاع قدرتش بطلیموس خفاشے از رسیدن بآفتاب حقیقت مایوس[2]"

عبدالرحمن الصوفی چوتھی صدی ہجری میں عضد الدولہ دیلمی کے دربار کا ایک عظیم
ہیئت داں تھا، علم الثوابت کے باب میں اس کی کتاب "صور الکواکب" علم ہیئت کی عالمی
ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے، الغ بیگ نے اپنی زیج میں ثوابت کی جو مبسوط فہرست
دی ہے، وہ الصوفی کی "صور الکواکب" سے متاثر ہو کر مرتب کی گئی تھی، اس نے اس کتاب کا
ایک مصور نسخہ اپنے یہاں تیار کرایا تھا اور دائرۃ المعارف حیدر آباد نے "صور الکواکب" کی
تیاری میں اس نسخہ سے بھی مدد لی ہے، راجہ جے سنگھ نے اپنی "زیج" کی آخری فصل میں کچھ اوپر
ساٹھ ستاروں کا طول و عرض دیا ہے، اس کے پیش نظر الغ بیگ کی مبسوط فہرست تھی جس سے
اس نے استفادہ بھی کیا تھا، اس استفادہ کا بدیں طور حوالہ دیتا ہے:

"چوں جدول الغ بیگی کافی بود، بآں قناعت کردہ شد[3]"

اور الغ بیگ الصوفی کی عظمت فن کی تعریف میں رطب اللسان ہے، چنانچہ تیسرے مقالہ کے
تیرہویں باب میں کہتا ہے:

"عبدالرحمن صوفی کتابے در معرفۃ ثوابت نوشتہ است کہ ہمہ فضلاء آں را تلقی بقبول

[1] زیج محمد شاہی ص اب [2] زیج محمد شاہی ص اب [3] زیج محمد شاہی ص ۸۲ ب۔

کردہ اند[1]"

اس لئے راجہ جے سنگھ جس کی زیج "زیج الغ بیگ" کی زیج کا چربہ ہے اس سے ا[illegible]
کتاب "صور الکواکب" سے ضرور واقف ہوگا، اگرچہ اس کی لائبریری میں ہنوز اس کی موجودگی
کی تصدیق نہیں ہوئی،

محقق طوسی (نصیر الدین طوسی) کی اہمیت و عظمت اسلامی علم الہیئت کی تاریخ میں کسی
تعارف کی محتاج نہیں ہے، اس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، وہ "زیجوں" کے اس
سلسلہ کا بانی ہے، جس کا اختتام راجہ کی "زیج محمد شاہی" پر ہوا، اور اگرچہ "زیج الغ بیگ"
کی اشاعت کے بعد اس کی پہلے کی سی مقبولیت نہیں رہی تھی، پھر بھی اکثر علمائے نخاریہ
زائچہ سازی میں اول الذکر کے بجائے اسی پر اعتماد کرتے تھے، چنانچہ مولانا الیاس اردبیلی نے
جو بادشاہ ہمایوں کے اساتذہ میں سے تھے اکبر کا زائچہ محقق طوسی کی مرتبہ "زیج ایلخانی" ہی کے
ذریعہ تیار کیا تھا، چنانچہ ابوالفضل "اکبر نامہ" میں اس کا عنوان بدیں طور دیتا ہے:

"صورت زائچہ واقدس منقول از خط مولانا الیاس اردبیلی موافق زیج ایلخانی[2]"

لہٰذا قیاس مقتضی ہے کہ راجہ نے اس سے بھی استفادہ کیا ہو، یا علی الاقل اس کے کتب خانہ میں
رہی ہو، اگرچہ قدر ناشناسوں کی بے اعتنائی کے بعد جے پور کی لائبریریوں میں اس کا پتہ
نہیں چل سکا۔

نصیر الدین طوسی کے دوسرے ہیئتی مصنفات میں "تحریر المجسطی" "تذکرہ فی الہیئۃ" "رسالہ ہیئتیہ"
"بست باب" خصوصیت سے مشہور ہیں، ممکن ہے یہ بھی راجہ کے پیش نظر رہے ہوں، بالخصوص آخرالذکر
جو اپنے موضوع پر انتہائی اہم شاہکار ہے، اور راجہ کو اس کی تیاری اور استعمال سے خصوصی

[1] زیج الغ بیگ، [2] اکبر نامہ ۱ ص ۲۰۔

دلچسپی تھی۔

علی بن محمد السید الشریف (میر سید شریف جُرجانی) کا زیج محمد شاہی میں کہیں مذکور نہیں ہے[1] وہ اپنے وقت کے عظیم عبقری ضرور تھے مگر اتنے عظیم المرتبت ہیئت داں نہیں تھے کہ ان سے عظیم تر ماہرین علم الہیئۃ کو نظر انداز کرکے راجہ ان کا ذکر کرتا، ان سے عظیم تر اور مقبول تر قاضی زادہ رومی تھے، جن کی شرح چغمینی آج کے دن تک ریاضی و ہیئت کے اعلیٰ نصاب میں داخل ہے، اور جنھوں نے میر سید شریف کے ریاضیات میں کمتر معیار کا اعلان کیا تھا[1]۔

ممکن ہے تذکرہ طوسی کی دوسری شروح کی طرح ان کی 'شرح تذکرہ' بھی راجہ کے کتب خانہ میں رہی ہو، مگر اس کی تصدیق کا کوئی امکان نہیں ہے، ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ نام ان کے رہنماؤں کی ستم ظریفی کا نتیجہ ہو، مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

جمشید بن مسعود 'جبات' (غیاث الدین) الکاشی کا ذکر اوپر آچکا ہے، الغ بیگ نے سمرقند میں جو عہد حاضر کی سب سے پہلی سائنٹفک اکیڈمی قائم کی تھی، وہ اس کے ارکان اربعہ میں سے تھے[2]۔ اور اس کی تعمیر کردہ رصدگاہ کے پہلے سربراہ[3]، مگر وہ اس سے کوئی آٹھ سال پہلے 'زیج ایلخانی' کی تکمیل و تتمیم کے لئے 'زیج خاقانی' کے نام سے ایک 'زیج' لکھ کر بادشاہ الغ بیگ کے نام معنون کرچکے تھے، مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

مولانا چند (چاند) کا ذکر بھی آگے آرہا ہے۔

---

[1] الشقائق النعمانیہ: الجزء الاول، ص ۱۸: قال السید الشریف فی حقه غلب علیٰ طبعه الریاضیات وقال هو فی حق السید الشریف هو لا یقدر علی الافادة لی فی العلوم الریاضیة۔ (میر سید شریف قاضی زادہ کے بارے میں کہتے تھے کہ ان کے مزاج پر ریاضیات کا غلبہ ہے، اور قاضی زادہ کہتے تھے کہ میر سید شریف مجھے ریاضیات نہیں پڑھا سکتے) [2] مطلع السعدین، ص ۲۳۸۔ [3] الشقائق النعمانیہ، ص ۱۷۸۔

اسلامی علم الہیئۃ کے مشہور و متعارف شاہکاروں میں سے راجہ جے سنگھ نے خصوصیت کے ساتھ چار کتابوں سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے

"زیجہائے متعارف زیج جدید سعید گورگانی و خاقانی و تسہیلات ملا چند اکبر شاہی و ملا فریدشاہجہانی"[1]

مگر فاضل مصنف نے ان چار کو تین میں بدل دیا ہے، لکھتے ہیں:

"He found that the Calculations of the stars as obtained from the tables in Common Use such as the new tables of SAID GURGANI (and KHAKHANI) and the Teshilat .. Mulla Chand Akbar Shahi and the Hindu books, and the European tables, in Very many Cases give them widely different from those determined by Observation"

(G. R. Kaye, p. 11)

مگر انتہائی افسوسناک تعجب ہے کہ انھوں نے اول الذکر کا مصنف 'میر سید شریف' کو سمجھ لیا، چنانچہ پائیں حواشی میں لکھتے ہیں:

"Possibly Ali b M. al Saiyed al-Sharif al-Gurgani

---

[1] زیج محمد شاہی، ص ۱ ب۔

who lived from A.D. 1339 to 1404 in Shiraz and wrote a Commentary on Nasir at Tusis' Tadkira"

[بہت ممکن ہے اس سے مراد علی بن ایم (محمد) السید الشریف الگرگانی ہوں جو ۱۳۳۹ء سے ۱۴۱۴ء تک شیراز میں رہے، اور جنھوں نے نصیر الدین طوسی کے "تذکرہ" پر شرح لکھی۔]

اس کے بعد موسیو سدیو کے حوالہ سے لکھا ہے کہ Gourgani الغ بیگ کے خاندان کو ظاہر کرتا ہے اور الغ بیگ کی جداول کو کبھی گورگانی قانون (زیج گورگانی) سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس تذبذب اور کوہ کندن وکاہ برآوردن کا باعث یہ ہے کہ فاضل مصنف نے "زیج محمد شاہی" کی فارسی اصل کے بجائے اس کے دیباچہ کے انگریزی ترجمہ پر اکتفا کر لیا۔ لہٰذا انھوں نے

۱. SA'EED 'سعید' کو SAID اور اس طرح Sayid اور

۲. Goorgani 'گورگانی' کو گرگانی سمجھا جس کا معرب 'جرجانی' ہے۔

اس طرح 'سعید گورگانی' کو 'سید گرگانی' سمجھ بیٹھے۔

اس قیاس آرائی کی تکمیل کے لئے 'سید' سے پہلے علی بن ایم (محمد) کا اور الگرگانی سے پہلے 'الشریف' کا اضافہ کر کے اسے 'علی بن ایم السید الشریف الگرگانی' بنا دیا، جلد ہی انہیں اس کے لئے سند بھی مل گئی، کیونکہ سوٹر نے عرب ریاضی دانوں کا جو تذکرہ لکھا ہے، اس کے صفحہ ۱۷۲ پر انھیں علی بن ایم السید الشریف کا نام مل گیا جن کے لئے سوٹر نے لکھا ہے کہ وہ شیراز میں ۱۳۳۹ء سے ۱۴۱۴ء تک بقید حیات تھے اور انھوں نے نصیر الدین طوسی کی 'التذکرہ' کی

شرح بھی لکھی تھی۔

مگر فاضل مصنف نے اس تحقیق انیق پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی، میر سید شریف بے شک ایک عالم المعی و فاضل لوذعی تھے، بیشک وہ متداول درسی کتابوں کے ضمن میں علم ہیئت کے درسی متون بھی پڑھاتے تھے اور ان پر شروح بھی لکھی ہیں، چنانچہ

۱. طاشکبری زادہ نے قاضی زادہ رومی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ موخر الذکر نے ان سے ریاضیات پڑھی تھی، مگر استاد شاگرد کو مطمئن نہ کر سکے۔

"قال السید الشریف فی حقه غلب علی طبعه الریاضیات وقال هو فی حق السید الشریف هو لا یقدر علی الافادة لی فی العلوم الریاضیة"[1]

(میر سید شریف قاضی زادہ کے بارے میں کہتے تھے کہ ان کے مزاج پر ریاضیات کا غلبہ ہے، اور قاضی زادہ کہتے تھے کہ میر سید شریف مجھے ریاضیات نہیں پڑھا سکتے)

۲. سخاوی نے الضوء اللامع میں ان کی تصانیف کی ایک مختصر فہرست دی ہے، ان میں دو کتابیں علم ہیئت میں ہیں، شرح تذکرہ اور شرح ملخص فی الہیئۃ[2] خوش قسمتی سے دونوں کے مخطوطے ہنوز موجود ہیں، پہلے کے کثیر تعداد میں اور دوسرے کے کم۔

غرض وہ علم ہیئت کے عالم ضرور تھے، مگر ہیئت داں نہیں تھے، نہ انھوں نے کوئی فلکیاتی مشاہدات کئے اور نہ کوئی زیج مرتب کی، رہی ان کی "شرح تذکرہ" اور "شرح چغمینی" تو یہ دونوں علم الہیئۃ کے درسی متون ہیں جو اس فن کے اصول و مبادی پر مشتمل ہیں، ان میں فلکیاتی جدول کوئی نہیں ہے اور اس لئے ان پر "زیج" کا اطلاق نہیں ہو سکتا، ان کے علاوہ انھوں نے کوئی زیج مرتب نہیں کی، چہ جائیکہ ایسی زیج جس پر "زیج متعارفہ" کا

---

[1] الشقائق النعمانیہ الجزء الاول، ص ۱۸ [2] الضوء اللامع الجزء الخامس، ص ۳۲۹.

اطلاق ہو سکے، حالانکہ راجہ جے سنگھ کو اپنے مخصوص مقصد کے لئے زیج کی ضرورت تھی، درسی متون کی نہیں۔

رہا دوسرا احتمال جو انھوں نے سدیو کے "مقدمۂ زیج الغ بیگ" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "الغ بیگ کی زیج کو اکثر "زیج گورگانی" کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا تھا، اسے انھوں نے اپنی پہلی تحقیق کی دھن میں زیادہ قابلِ اعتبار نہ سمجھا اور جو دور کی کوڑی لائے تھے اسی پر مصر رہے اسی لئے انھوں نے اپنی فاضلانہ تصنیف کے آخری باب میں جہاں جے سنگھ کی تصنیفات کے اشخاص کی فہرست دی ہے اس میں علی بن محمد السید الشریف (۱۳۳۹ء، ۱۴۱۴ء) کا نمایاں طور پر ذکر کیا ہے[۱]، اسی طرح صفحہ ۴۴ پر نصیر الدین طوسی کے ساتھ اس کے شارح کی حیثیت سے ان کا بھی ذکر کیا ہے، بلکہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ میر سید شریف کا نام خود راجہ جے سنگھ نے اپنی زیج میں لیا ہے:

"In the preface to his own catalogue — he not only mentions Nasir al-Din al-Tusi, ... but also his Commentator (Ali b.m) al-Gurgani"

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جے سنگھ نے کہیں بھی میر سید شریف کے نام یا کام سے تعرض نہیں کیا۔ اس نے تو یونانی، عربی ہیئت کے اساطین کبار ابلونیوس وارشمیدس، ارسطرخس، وادطولوقیوس، ثاوذوثیوس، وذالاوس، یحییٰ بن ابی منصور، عباس بن سعید الجوہری، بنو موسیٰ، ثابت بن قرہ حتیٰ کہ البتانی، ابو الوفا، ابو ریحان البیرونی، ابن الہیثم اور ابن یونس تک کو درخورِ ذکر نہیں سمجھا۔

غالباً یہ سارا خلط مبحث لفظ "سعید" سے پیدا ہوا ہے، مگر یہ الغ بیگ کا خطاب ہے۔

---

[۱] G. R. Kaye, P. 88.

جو مرنے کے بعد اسے دیا گیا تھا، چنانچہ دولت شاہ "تذکرۃ الشعراء" میں اس کا ذکر بدیں طور کرتا ہے:

"اما شان مغفور سعید الغ بیگ گورگان سقی اللہ روضتہ، وانار اللہ برہانہ ... الخ"[۱]

واضح رہے کہ الغ بیگ نے اپنی زیج کا کوئی نام نہیں رکھا، وہ اسے صرف "کتاب" کہتا ہے، جو گویا اس کے فلکیاتی مشاہدات کی ایک یادداشت ہے، جیسا کہ دیباچہ میں لکھتا ہے:

"آنچہ از روشِ سیارگان برصد وامتحان معلوم شد، دریں کتاب ثبت افتاد"[۲]

دولت شاہ کہتا ہے کہ اس نے اسے اپنے نام سے موسوم کیا تھا:

"وزیج سلطانی اخراج نمودہ وخطبہ بنام خود نوشت"[۳]

عبد الرزاق کاشی نے اس کا نام "زیج سلطانی گورگانی" بتایا ہے۔

"آں زیج تصحیح یافتہ باتمام رسید وبزیج سلطانی گورگانی موسوم شد"[۴]

حسن رو ملو نے اس کا نام زیج جدید سلطانی گورگانی لکھا ہے، احسن التواریخ میں کہتے ہیں:

"شاہزادہ بہ تصحیح آں زیج موفق گردیدہ بہ اتمام رسید وبزیج جدید سلطانی گورگانی موسوم شد"[۵]

صاحب "روضۃ الصفاء" نے اس کا نام "زیج جدید گورگانی" بتایا ہے، زیادہ قابلِ اعتماد قول علامہ برجندی کا ہے، جنھوں نے اس کی ایک مبسوط شرح لکھی ہے، انھوں نے اس کا نام "زیج جدید سلطانی" بتایا ہے[۶]۔

متاخرین میں یہ زیج "الغ بیگی" کے نام سے مشہور تھی، چنانچہ محمد صالح کنبو نے "عمل صالح" میں

---

[۱] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ص ۳۶۱۔ [۲] زیج الغ بیگ ص ۲ ظ [۳] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ص ۳۶۲،
[۴] مطلع السعدین، ص ۲۳۹، [۵] احسن التواریخ ص ۱۱۸ (وقائع سال ۸۲۲ھ واقعات متنوعہ)
[۶] ورق ۱ ب۔

ملّا فرید منجم کے تذکرہ میں ان کی مرتبہ "زیج شاہجہانی" کی تعریف میں لکھا ہے :

"بالفعل اہل ایں فن از زیج الغ بیگی مستغنی شدہ"[1]

بہرحال راجہ جے سنگھ نے اسے "زیج جدید سعید گورگانی" لکھا ہے .

خاقانی (زیج خاقانی) کے مصداق کے تعین میں بھی فاضل مصنف نے "زیج جدید سعید گورگانی" جیسے تذبذب کا اظہار کیا ہے. اس کے سلسلہ میں بھی دو رائیں دی ہیں، پہلے حسب سابق سوٹر کا سہارا لیا ہے اور بڑی دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ حاشیہ میں لکھتے ہیں :

"سوٹر (ص ۹۵) ایک ہیئت داں اور نجومی الخاقانی کا ذکر کرتا ہے جس نے ۱۰۳۶ء میں وفات پائی اور جس نے ہیئتی جداول کی اصلاح پر کام کیا"

سوٹر کا ماخذ ابن القفطی کی "تاریخ الحکماء" ہے، جس میں اس نے لکھا ہے :

الخاقانی المنجم، وکان موصوفاً	خاقانی منجم، علم نجوم، اس کی تسییر نیز زیجوں کے
بعلم النجوم وتسییرھا وحلّ	حل کرنے، ان کے طبائع پر بحث کرنے
ازیاجھا والکلام علیٰ طبائعھا	اور ان سے جو حوادث کے احکام صادر
واحکام الحوادث الصّادرۃ	ہوتے ہیں (ان میں تبحر کے لئے) مشہور تھا
عنہا، ولہ اشتہار بذلک ،	اسی میں اس کی شہرت ہے، اس نے
توفی فی العشر الثالث من سنی	پانچویں صدی ہجری کی تیسری دہائی میں
المائۃ الخامسۃ للھجرۃ .	وفات پائی .

(تاریخ الحکماء لابن القفطی ص ۱۸۱)

مگر اس حوالہ کو درخور اعتناء سمجھنے سے پہلے انھیں چند باتوں پر غور کر لینا چاہئے :

[1] عمل صالح، ص ۳۶۲،

اولاً : حسب تصریح ابن القفطی خاقانی نے ۴۳۰ھ (جو سوٹر کے حساب سے ۱۰۳۶ء کے مطابق ہے) کے قریب وفات پائی، بالفاظ دیگر وہ ابوریحان البیرونی، ابن الہیثم اور ابن یونس کا ہمعصر تھا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر راجہ جے سنگھ خاقانی جیسے غیر معروف منجم کی مزعومہ زیج سے استفادہ کر سکتا تھا تو اسے اس کے معاصرین (جو علم ہیئت کی عالمی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں) کی ہیئتی تصانیف بالخصوص "زیجوں" کے درخور اعتناء سمجھنے میں کیا امر مانع تھا. البیرونی کی "قانونِ مسعودی" میں ہیئتی مباحث کے علاوہ متعدد ہیئتی جداول بھی ہیں اور ابن یونس کا شاہکار "الزیج الکبیر الحاکمی" تو ہے ہی .

ثانیاً : خاقانی ہیئت داں سے زیادہ نجومی تھا، جیسا کہ پیشین گوئیوں میں اس کی حذاقت واصابت کے بارے میں ابن القفطی نے لکھا ہے :

"وکان موصوفاً ..... باحکام الحوادث الصّادرۃ عنہا".

اور اسی لئے اس کی شہرت تھی (ولہ اشتہار بذلک) مگر راجہ کو صحیح نجومی پیشین گوئیوں کے اصول جاننے کی ضرورت نہ تھی، وہ تو ایسی "زیج" اور "تقویم" چاہتا تھا جس کی مدد سے مختلف مظاہر فلکی کے وقوع کا حساب مشاہدہ اور ارصاد کے مطابق ہو .

ثالثاً : خاقانی کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں ہے . زیج کا کیا سوال، ابن القفطی کی تصریح کے مطابق وہ زیجوں کے حل کرنے میں ماہر تھا (وکان موصوفاً بعلم النجوم ..... وحل ازیاجھا) خود اس نے کوئی زیج نہیں لکھی، اور اگر کوئی یادداشت لکھی بھی ہو تو وہ مظاہر فلکی کے اوقات کے استخراج پر نہیں ہوگی، بلکہ حوادث کائنات میں ان کے اثر و تاثیر پر ہوگی، جیسا کہ ابن القفطی کے الفاظ "طبائعھا واحکام الحوادث الصّادرۃ عنہا" سے ظاہر ہے .

لہٰذا فاضل مصنف کی یہ کاوش بیش از کوہ کندن وکاہ برآوردن نہیں ہے .

اس کے بعد انھوں نے دوسری رائے لکھی ہے:

"زیج خاقانی نصیر الدین طوسی کی زیج ایلخانی کا تکملہ تھی، جسے جمشید الکاشی نے مرتب کیا تھا"

مگر انھوں نے اپنا ماخذ نہیں بتایا، ویسے ظاہر ہے یہ سوٹر کے قول کا تسلسل تو ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ "زیج خاقانی" کو "زیج ایلخانی" کا تکملہ بتاتے ہیں، جو ۱۲۷۱ھ کے قریب مرتب ہوئی تھی، حالانکہ بقول سوٹر خاقانی نے ۱۰۳۵ھ میں وفات پائی۔

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ زیج خاقانی، غیاث الدین جمشید کاشی کی تصنیف ہے، جسے انھوں نے ۸۱۶ھ میں مکمل کر کے بادشاہ الغ بیگ کے نام معنون کیا تھا، مزید تفصیل حسب ذیل ہے:

تیموری سلاطین میں الغ بیگ کو یہ امتیازی شرف حاصل ہے کہ اس نے نہ صرف عجم کی آخری اہم رصد گاہ تعمیر کرائی، بلکہ عہد حاضر میں سب سے پہلی سائنس اکیڈمی قائم کی، چنانچہ عبد الرزاق کاشی 'مطلع السعدین' میں اس کی علم دوستی کے بارے میں لکھتا ہے:

"با خواص حکماء، و فحول عقلاء مہندسین عطارد ذکا و فیلسوفان مجسطی کشا کہ در جمیع علوم و حقائق معقول و مفہوم بتخصیص ریاضی و حکمی عجوبۂ عصر و نادرہ دہر بودند، مثل افلاطون زماں مولانا صلاح الدین موسیٰ قاضی زادہ رومی و بطلمیوس دوراں مولانا علاء الدین علی قوشجی کہ تربیت یافتۂ مرزا الغ بیگ بود و بزبان عنایت او را فرزند خطاب فرمود، و ایں دو محقق دانشمند در سمرقند اقامت داشتند، و مولانائے اعظم غیاث الدین جمشید و مولانائے معظم معین الدین کہ مرزا الغ بیگ ایشاں را از کاشان بسمرقند بردہ بود، انجمنے ساخت[1]"

اس مجلس علمی کے ارکان کی بیشتر توجہ ریاضیات، بالخصوص ہیئتی تحقیقات پر مبذول رہی، چنانچہ صاحب "مطلع السعدین" نے ان کی ہیئتی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا ہے:

[1] مطلع السعدین، ص ۲۳۸۔

"در معرفت دقائق تنجیم و ادراک غوامض تقاویم آں دانشوراں کہ بمدد عقل کل بر کیفیت ہر جزوے از اجزائے سپہر واقف بودند و بخطوات اقدام مسافر وہم کمیت طول و عرض عالم علوی می پیمودند و در تحقیق ابعاد و سطوح اجرام ہیچ دقیقہ مہمل و ہیچ ثانیہ نا مرعی نماند، و در ارتفاع درجات مرتبہ سخن بفلک الافلاک رسانندہ سخناں پرداخت[1]"

یہ مجلس علمی ۸۱۵ھ سے کچھ پہلے قائم ہوئی تھی، اس کے ارکان اربعہ میں سے مولانا معین الدین کاشی کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں، مولانا علاء الدین علی قوشجی ابھی حداثت سن میں تھے، البتہ باقی دو فاضلوں مولانا غیاث الدین جمشید کاشی اور قاضی زادہ رومی نے اس زمانہ (۸۱۵ھ) کے قریب ریاضی و ہیئت کے لافانی شاہکار مرتب کر کے قدردان بادشاہ کے نام معنون کئے، قاضی زادہ رومی نے "شرح چغمینی" اور "شرح اشکال التاسیس" اور مولانا غیاث الدین جمشید کاشی نے (اور علمی شہ پاروں کے علاوہ) "زیج خاقانی" انھوں نے یہ زیج جیسا کہ انڈیا آفس لائبریری کے فہرست نگار نے تصریح کی ہے، ۸۱۶ھ میں مکمل کی تھی، اس زیج کا واحد نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے[2] (نمبر ۲۲۳۲)

البتہ فہرست نگار کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ یہ "زیج الغ بیگ" کا ابتدائی ایڈیشن ہے:

"Zij-i-Khaqani (زیج خاقانی) the first or orignal edition of the shronological and astronomical tables of Sultan Ulugh Beg bin Shahrukh bin Timue Cruganmm with a detailed description,

[1] مطلع السعدین ص ۲۳۸۔

[2] Catalogue of India Office Library Persian Manuscripts, Col 1220-1221

Compiled under his superintendence by Jamshed bin Masud bin Muhammad al-Talib al kashi.[1]

کیونکہ زیج الغ بیگ رصدگاہ سمرقند کے ارصادات کے قلم بند کرنے کے لئے مرتب کی گئی تھی،[2] مگر یہ رصدگاہ حسب تصریح "حبیب السیر" و "احسن التواریخ" ۸۲۳ھ میں بننا شروع ہوئی تھی اور پیش نظر زیج خاقانی حسب تصریح فہرست انڈیا آفس لائبریری ۸۱۶ھ میں مکمل ہوئی تھی، لہٰذا رصدگاہ کے قیام سے پہلے اس کے ارصادات کے قلمبند کرنے کا کیا سوال، خود بادشاہ الغ بیگ صراحت کرتا ہے کہ غیاث الدین جمشید اس قسم کے کسی کام کو انجام دینے سے پہلے ہی وفات پاگئے،[3] نیز زیج خاقانی کا انداز ترتیب و تبویب بھی زیج الغ بیگ سے قطعاً مختلف ہے، زیج الغ بیگ میں چار مقالے ہیں:

۱. مقالۂ اول۔

۲. مقالۂ دوم۔

۳. مقالۂ سوم۔

۴. مقالۂ چہارم۔

لیکن زیج خاقانی میں چھ مقالے ہیں، بہ ترتیب ذیل:

۱. مقالۂ اول در معرفت تواریخ مشہورہ۔

۲. در معرفت جیب و سہم و ظل و میل و مطالع، ذکر طول و عرض بلدان۔

۳. در معرفت مواضع کواکب در طول و عرض و توابع آں۔

۱؎ فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری کالم ۱۲۲۱ - ۱۲۲۰ ۲؎ زیج الغ بیگ ص ۲ ب
۳؎ زیج الغ بیگ ص ۲ ب -

۴. در استخراج سائر قسی و خطوط مشہورہ۔

۵. در معرفت طالع از معلومات مختلفہ۔

۶. در باقی اعمال نجومی کہ آں تیسیرات است الخ

لہٰذا مولانا غیاث الدین جمشید کاشی نے "مفتاح الحساب" کے دیباچہ میں اس زیج کا جو تعارف کرایا ہے، اس میں رصدگاہ سمرقند کے ارصادات کا ادنیٰ الہام بھی نہیں ہے (اور ہو بھی نہیں سکتا تھا) اس کے برخلاف وہ اسے "زیج ایلخانی" کی اصلاح یا نظر ثانی یا تکملہ بتاتے ہیں، فرماتے ہیں:

استأنفت استخراج جمیع	میں نے زیج ایلخانی کی تمام جدولوں کا
جداول الزیج الایلخانی	از سر نو بڑی دقت نظر کے ساتھ استخراج
بادق عمل ووضعت الزیج	کیا، اور اس طرح وہ زیج مرتب کی، جو
المشہور بالخاقانی فی تکمیل	"زیج خاقانی در تکمیل زیج ایلخانی" کے
الزیج الایلخانی وجمعت فیہ	نام سے مشہور ہے، اس کے اندر میں نے
جمیع ما استنبطت من اعمال	سابق ہیئت دانوں کے اعمال سے
المنجمین فیما لا یأتی من زیج	جو کچھ مستنبط کیا تھا اور جو دوسری
آخر مع البراھین الھندسیۃ۔[1]	زیجوں میں نہیں ملیں گے، مع ان کے
	ہندسی دلائل کے جمع کیا ہے۔

(باقی)

۱؎ مفتاح الحساب مولانا جمشید کاشی مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، ذخیرہ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نمبر ۶۹۰/۸ علوم ہیئت و ہندسہ جبر و مقابلہ و حساب۔

امام ربیع بن سلیمان مرادی

از

حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی، رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ

(۲)

امام ربیع کی نشستوں میں صرف کتاب الام، کتاب الحجۃ یا مبسوط کی روایت اور املا ہی محدود نہ تھا، امام شافعی کی شخصیت سے متعلق اہم، غیر اہم اور کلی وجزئی، ہر قسم کی باتوں کا ذکر ان نشستوں میں ہوتا تھا، سیرت شافعی کا تقریباً نصف حصہ امام ربیع کی یادداشتوں پر منحصر ہے، سیرت ربیع کا مطالعہ کرنے والوں کو خود امام ربیع سے متعلق تفصیلات اگر کم ملتی ہیں تو یہ تعجب کی بات نہیں، ان مخلص حضرات کی ساری تگ ودو محبوب استاذ کی ذات اور تعلیمات کے لئے وقف تھی، انھیں اپنے استاذ کے علم اور تفقہ پر اعتماد کامل تھا، چنانچہ امام ربیع فرماتے ہیں کہ اصحاب حدیث تفسیر حدیث سے ناواقف تھے، یہاں تک کہ امام شافعی نے تفسیر حدیث کی بنیاد ڈالی[1]، وہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی صحیح معنوں میں عربی النسل اور عربی اللسان تھے[2]، ایک موقع پر شاگردوں سے فرمایا کہ اگر تم لوگ امام شافعی کو دیکھتے تو کہہ اٹھتے کہ ان کی زبان کے سامنے ان کی یہ کتابیں کچھ نہیں، بخدا ان کی زبان ان کی کتابوں سے کہیں زیادہ فصیح وبلیغ تھی، البتہ وہ اپنی تالیفات میں اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ وہ عوام کے لئے واضح اور سلیس

[1] توالی التاسیس: عسقلانی، ص ۵۹ [2] معجم المصنفین ص ۲۶۹۔

زبان میں ہوں[1]۔

ایک موقع پر فرمایا کہ تمام محدثین پر امام شافعیؒ کا احسان ہے، کسی نے دریافت کیا وہ کیسے؟ فرمایا کہ اصحاب رائے اصحاب حدیث کا مذاق اڑاتے تھے، یہاں تک کہ امام شافعیؒ نے انھیں علم سکھایا اور ان کے خلاف حجت قائم کی، وہ امام شافعی کے اس قول کی اکثر تکرار کرتے کہ کون سا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کون سی زمین مجھے پناہ دے گی، اگر میں کسی حدیث نبویؐ کی روایت کروں اور پھر اس پر فتویٰ نہ دوں[2]۔ یہ قول بھی امام ربیع نے اکثر نقل کیا کہ اگر تم میری کتاب میں حدیث نبوی کے خلاف کچھ پاؤ تو میرے قول کو بالکل ترک کر دو اور حدیث کو اختیار کرو[3]۔ اگر میں کسی صحیح حدیث کو نقل کروں لیکن اس پر فتویٰ نہ دوں تو گواہ رہو کہ میری عقل جاتی رہی ہے[4]۔

ان اقوال سے جہاں امام ربیع کا فکری رخ متعین ہوتا ہے وہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ امام شافعی اپنے شاگردوں کی ذہنی تربیت کس نہج پر کرتے تھے، ایک بار امام شافعی نے امام ربیع سے فرمایا میں نے تم کو اتنا سکھا دیا ہے جو تمھیں ان شاء اللہ بے نیاز کر دے گا، لیکن یہ اصول یاد رکھو کہ کسی حدیث پر عمل کو مت ترک کرو، سوائے اس کے کہ اس حدیث کے مفہوم کے خلاف کوئی دوسری حدیث بھی موجود ہو، اختلاف احادیث کی صورت میں تطبیق کی امکانی فکر وکوشش کے بعد جو رائے قائم ہو اس پر عمل کرو[5]۔

ایک مرتبہ فرمایا: اے ربیع! مسائل (استفسار) کے جواب دو، خواہ اس میں خطا کا امکان ہو، کیونکہ بغیر خطا کیے کوئی صحیح فیصلے نہیں کر سکتا، ان کے الفاظ ہیں:

اجب یا ربیع فی المسائل فانہ — اے ربیع! مسائل کا جواب دو، کیونکہ
لا یصیب احد حتی یخطی[6] — جب تک کوئی غلطی نہ کرے، صحیح جواب

[1] معجم المصنفین ص ۲۷۰ [2] توالی التاسیس ص ۶۳ [3] ایضاً ۲ [4] ایضاً ص ۶۱ [5] ایضاً ص ۶۲۔
[6] تہذیب الاسماء، نووی ص ۱۸۹۔

نہیں پہونچ سکتا۔

تربیت کے یہ وہ حکیمانہ اصول تھے جن سے آراستہ ہوکر امام ربیع اور ان کے دوسرے تلامذہ نے ایک مختصر عرصہ میں اپنے استاذ کے مسلک کو تقریباً سارے عالم اسلام میں رائج کر دیا۔

امام ربیع شاعر تو نہیں تھے، لیکن امام شافعی جیسے باکمال اہل زبان بلکہ عربی شاعری کے مزاج داں کے فیض اثر سے وہ حسن ذوق اور سخن فہمی سے محروم بھی نہیں تھے، امام شافعی کے بہت سے اشعار ان سے منقول ہیں، امام سبکی اور ابن اثیر نے ان اشعار کو تفصیل سے بیان کیا ہے، یہاں صرف چار اشعار نقل کئے جا رہے ہیں جنھیں امام شافعیؒ نے خاص طور سے امام ربیع کو سنایا تھا[1]

صدیق لیس ینفع یوم بأس — قریب من عدو فی القیاس

وما یبقی الصدیق بکل عصر — ولا الاخوان الا للتآسی

عمرت الدهر ملتمسا بجهدی — اخا ثقة فاکداه التماسی

تنکرت البلاد علی حتی — کان اناسها لیسوا بناس

(ایسا دوست جو مصیبت کے وقت کام نہ آئے، سمجھو کہ وہ تقریباً دشمن ہے، ہر زمانہ میں دوستوں اور بھائیوں سے غمخواری کی آس رہتی ہے، ایک قابل اعتماد دوست کی تلاش میں زندگی گذری لیکن محرومی ہاتھ لگی، میرے لئے سارا شہر اجنبی ہے، گویا یہاں کے لوگ انسان ہی نہیں۔)

امام ربیع کے سوانح حیات میں جگہ جگہ امام شافعی سے متعلق اقوال واحوال نظر آتے ہیں، لیکن یہ امام شافعی کے سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پروئے،

[1] طبقات کبری: سبکی ج ۱، ص ۱۵۰۔

امام ربیع سے متعلق تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے عالی مرتبت استاذ کا ایسا اثر قبول کیا کہ ان کی ساری زندگی استاذ کے علم، فکر اور خیالات و تصورات کا پرتو ہوگئی تھی، دوشنبہ ۲۰ شوال ۲۷۰ھ ۸۸۴ء میں علم و فضل کا یہ گل سر سبد مصر کی سرزمین میں آسودۂ خاک ہوگیا[1] مشہد قبرستان قرافہ میں تدفین ہوئی[2] اس وقت کے مصری حکمراں خمارویہ بن احمد بن طولون نے نماز جنازہ پڑھائی[3] اور اس طرح امام شافعی کے اصحاب میں وہ سب سے آخری تھے جو اپنے محبوب استاذ سے جا ملے، ابن خلکان نے حافظ منذری کے دو شعر نقل کئے ہیں جو انھوں نے امام ربیع کی وفات پر کہے تھے[4]

صبرا جمیلا ما اسرع الفرجا — من صدق الله فی الامور نجا

من خشی الله لم ینله اذی — ومن رجا الله کان حیث رجا

(صبر جمیل اختیار کرو، کشایش جلدی ہے، جو معاملات میں اللہ کی تصدیق کرے وہی نجات یافتہ ہے، جو اللہ سے ڈرتا ہے اسے کوئی تکلیف نہیں، اور جو اللہ سے پرامید رہتا ہے اس کی امید پوری ہوکر رہتی ہے)

امام ربیع نے ورثہ میں ایک صاحبزادہ ابو المعنی محمد کے علاوہ جو ان کے بعد تین سال زندہ رہے[5] تلامذہ و تالیفات کے گراں قدر خزانے چھوڑے، ان کے تلامذہ کی تعداد یوں تو ہزاروں سے بھی متجاوز رہی ہے، لیکن تاریخ نے جن چند جلیل القدر اور عالی مرتبت حضرات کے اسمائے گرامی محفوظ کر رکھے ہیں، ان میں ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابو زرعہ، ابو حاتم، عبد الرحمن بن ابی حاتم، ابن خزیمہ، محمد بن جریر طبری، زکریا ساجی، طحاوی، محمد بن زیاد نیشاپوری، حسن

[1] اعلام ج ۱، ص ۳۱۶، تہذیب التہذیب ج ۳، ص ۲۵۴ [2] وفیات: ابن خلکان ص ۳۲۷

[3] طبقات: سبکی ج ۱، ص ۲۶۰ [4] وفیات ابن خلکان، ص ۳۲۷۔

ابن حبیب مصایری، ابن صاعد، ابو العباس اصم، ابو الفوارس سندی، محمد بن طائف
بغدادی، محمد بن ہارون رویانی، ابو نعیم عبد الملک جرجانی، عبد اللہ بن یوسف موصلی، ابن سیف
ابو بکر محمد بن احمد خلالی، عبد اللہ بوشنجی، ابو الحسین اصفہانی[۱]، ابو سعید فریابی، محمد بن نصر مروزی،
ابو یعقوب اسفرائنی، ابو عبد اللہ ہروی، عثمان بن سعید انماطی، کنیز، نوح بن منصور شیرازی
جیسے ائمہ حدیث وفقہ ہیں، ان میں سے ہر ایک خود صاحب تذکرہ ہے، ایسے گلہائے رنگارنگ
سے خود صاحب چمن کی گلستاں بکنار شخصیت کا اندازہ ارباب ذوق ونظر بخوبی لگا سکتے ہیں

ان کی تصانیف میں علامہ سیوطی نے کتاب الام، امالی اور مختصر ربیع کا ذکر کیا ہے[۲]
ایک اور کتاب اصول الفقہ کے نام سے بھی ہے جو مصر سے شائع ہو چکی ہے[۳] لیکن جیسا کہ
علامہ سبکی نے کہا ہے یہ کتابیں در اصل امام شافعی کی ہیں، ربیع صرف ان کے راوی ہیں[۴]
ان کتابوں میں کتاب الام سب سے اہم، مکمل اور متداول کتاب ہے، اس کتاب کے بارہ
میں علامہ عسقلانی کا خیال ہے کہ اس کے جامع بویطی ہیں، لیکن وہ منسوب امام ربیع کی جانب[۵]
صاحب کشف الظنون کے خیال کے مطابق کتاب الام کی تصنیف امام بویطی نے کی ہے لیکن
ابواب کی تقسیم وتعیین امام ربیع نے کی، بعد میں تصنیف کی نسبت بھی انہی کی طرف ہو گئی[۶]
لیکن ایک محقق کا یہ قول زیادہ صحیح ہے کہ کتاب الام میں امام شافعی کے اقوال کو پہلے امام
بویطی نے جمع کرنا شروع کیا تھا، لیکن اس کی تکمیل امام ربیع کے ہاتھوں سے ہوئی ہے[۷] تعجب ہے کہ

۱ انھیں وراق ربیع بن سلیمان بھی کہا جاتا ہے، طبقات کبریٰ ج ۲، ص ۱۹۔ ۲ حسن المحاضرہ ص ۱۴۲،
۳ معجم المطبوعات: سرکیس ج ۱، ص ۴۶۹ ۴ طبقات: سبکی ج ۱، ص البدایۃ والنہایۃ
ج ۱۰، ص ۲۵۲، ۵ معجم المصنفین ۶ کشف الظنون ج ۲، ص ۲۶۶،
۷ اختلاف الفقہاء للطحاوی: مقدمہ ص ۱۲۔

امام الحرمین نے اسے امام شافعی کی کتاب قدیم بتایا ہے، ابن اثیر نے اس قول پر حیرت کے
اظہار کے بعد لکھا ہے کہ امام ربیع بالاتفاق اس کتاب کے راوی ہیں، چونکہ وہ مصری ہیں
اس لئے یہ کتاب امام شافعی کے قدیم اقوال پر مشتمل نہیں ہو سکتی[۱]

صاحب کشف الظنون نے اس کتاب کی پندرہ جلدیں گنائی ہیں، لیکن ہمارے
سامنے مصر سے شائع شدہ سات جلدوں میں مکمل کتاب الام موجود ہے، جس کے حاشیہ
پر مختصر مزنی بھی درج ہے، اور اب یہی متداول ہے، اس کتاب پر آئندہ ایک مستقل مضمون
میں بحث کی جائے گی۔

امالی ومختصر ربیع کا اب کہیں ذکر نہیں ملتا۔

ابن ندیم کی تحقیق کے مطابق امام شافعی کی اصل کتاب مبسوط ہے[۲] جس کے راوی
امام ربیع ہیں، امام ربیع فرماتے ہیں کہ امام شافعی نے اس کتاب کو صرف حافظہ کی مدد سے
مرتب فرمایا تھا، اس کی تالیف کے وقت ان کے پاس کوئی دوسری کتاب نہ تھی[۳]، ابن ندیم
نے اس کتاب کے تقریباً ۱۱۲ ابواب بھی شمار کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ مبسوط کے نام سے
ایک اور مجموعہ امام زعفرانی کا بھی تھا، اور یہ بالکل امام ربیع کی ترتیب کے مطابق تھا،
لیکن لوگوں نے اس مجموعہ سے زیادہ رغبت کا اظہار نہیں کیا، فقہاء کا عمل بھی اس پر
نہیں رہا، فقہاء کی معمول بہ کتاب امام ربیع کی مبسوط ہی رہی، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ اب ہمیں
زعفرانی کی مروی کتابوں کے عناوین لکھنے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ وہ اب کمیاب ہیں،
اکثر حصہ ان کا نایاب ہے، پھر بعد میں انھیں دوبارہ لکھا بھی نہیں گیا[۴] لیکن حیرت ہے کہ

۱ البدایۃ والنہایۃ ج ۱۰، ص ۲۵۲ ۲ الفہرست: ابن ندیم ص ۲۹۵ ۳ معجم المصنفین ص ۲۹۸،
۴ فہرست: ابن ندیم، ص ۲۹۷۔

مبسوط کا ذکر حاجی خلیفہ نے نہیں کیا، دوسرے مورخین نے بھی مبسوط کا ذکر نہیں کیا حالانکہ ابن ندیم اسے سب سے اہم مانتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ کتاب الام کو یا اس کے بعض اجزاء کو مبسوط کے نام سے تعبیر کر دیا گیا ہو، مجھے بھی کتب خانوں کی فہرست میں مخطوطات و مطبوعات دونوں میں یہ کتاب نہ مل سکی۔

امام ربیع سے روایت شدہ کتابوں میں مسند شافعی بھی ہے[1]، اس کے بارے میں کبھی یہ خیال تھا کہ کتاب الام کا دوسرا نام ہی مسند شافعی ہے[2]، لیکن یہ رائے صحیح نہیں تھی، چنانچہ علامہ سیوطی نے تدریب الراوی میں لکھا کہ یہ امام شافعی کی کوئی مستقل تصنیف نہیں، بلکہ ابوجعفر محمد بن مطر نیشاپوری نے محمد بن یعقوب اصم، شاگرد ربیع سے کتاب الام کے بعض مباحث سنے اور نقل کیے، انہی کے مجموعہ کا نام مسند شافعی ہے[3]۔

صاحب معجم المصنفین مولانا محمود حسن ٹونکی نے اپنے استاذ شیخ الحدیث حسن بن محسن انصاری یمنی بھوپالی نزیل ہند سے امام ربیع تک اپنے سلسلۂ سند کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مسند شافعی، کتاب الام کے علاوہ ایک دوسری تصنیف ہے[4]۔

لیکن شاہ عبدالعزیز دہلوی نے وضاحت سے لکھا ہے کہ مسند شافعی اصلاً ان احادیث مرفوعہ کا مجموعہ ہے جنہیں امام شافعی اپنے شاگردوں کے سامنے سند کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے، کتاب الام اور مبسوط میں واقع ان احادیث بالاسناد کو امام ربیع سے سن کر ان کے شاگرد ابو العباس اصم نے یکجا کر دیا، ان احادیث میں سوائے چار حدیثوں کے جو امام بویطی سے مروی ہیں بقیہ کل احادیث کے راوی امام ربیع ہیں[5]۔

۱؎ تاریخ التشریع الاسلامی: محمد خضری ص ۳۳۶ ۲؎ معجم المصنفین ص ۳۰۴ ۳؎ کشف الظنون ج ۲، ص ۱۶۸۳ ۴؎ معجم المصنفین ص ۳۰۵

۵؎ بستان المحدثین: شاہ عبدالعزیز دہلوی ص ۳۔

اب یہ مسند مصر سے شائع شدہ کتاب الام کی چھٹی جلد کے حاشیہ پر زیور طبع سے آراستہ ہوگئی ہے[1]، اس کے طابع احمد بک حسینی نے لکھا ہے کہ شام کے ایک قدیم نسخہ کے مطابق اس کتاب کی اشاعت ہوئی، یہ مخطوطہ ائمہ محدثین کی سماعات و اسانید سے بھی مزین ہے سب سے آخری سماعت حدیث کا سال ۶۶۰ھ درج ہے[2]۔

اس مطبوعہ مسند کی فہرست دیکھ کر شاہ عبدالعزیز دہلوی کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ یہ کوئی مرتب مسند نہیں[3]، مثلاً کتاب الطلاق کے معاً بعد کتاب العتق اور پھر کتاب جراح العمد ہے کتاب الجزیہ کے بعد کتاب اختلاف مالک والشافعی ہے، کتاب الاشربہ اور فضائل قریش کا باب ساتھ ساتھ ہے، کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب الحج اور کتاب الکسوف مکرر ہیں[4]۔

کتاب الام کی ساتویں جلد کے حاشیہ پر امام ربیع سے مروی ایک کتاب اختلاف الحدیث بھی موجود ہے۔

امام ربیع اپنی روایت میں اس درجہ ثقہ سمجھے جاتے ہیں کہ اگر کسی روایت کے بارہ میں ان کے اور امام مزنی کے درمیان اختلاف ہوتا ہے تو امام مزنی کی جلالت شان، اصول فقہ سے زیادہ موافقت اور درایت و قیاس سے قربت کے باوجود اصحاب شافعی امام ربیع ہی کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں[5]، علامہ سبکی نے مکاتب کے ایک مسئلہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس میں گو درایت کے لحاظ سے امام مزنی کا قول اصح ہے لیکن ابن سریج کے قول کے مطابق صحیح صورت وہی ہے جو امام ربیع سے منقول ہے، امام الحرمین نے ابن سریج کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ابن سریج نے امام ربیع کی روایت کو تفقہ کے اعتبار سے درست نہیں سمجھا بلکہ روایۃً اسے

۱؎ کتاب الام، مطبوعہ مطبعہ امیریہ ۱۳۲۲ھ ۲؎ مسند شافعی برحاشیہ کتاب الام ج ۶، ص ۲۸۰

۳؎ بستان المحدثین ص ۳۰ ۴؎ مسند شافعی مذکور ص ۷، ۵؎ طبقات: سبکی ج ۱، ص ۲۵۹۔

زیادہ معتبر قرار دیا ہے۔[1]

خود امام مزنی کا یہ حال تھا کہ اگر کبھی امام شافعی کی مجلس میں وہ شریک نہ ہو سکتے تو فوت شدہ مسائل کو حل کرنے میں امام ربیع کی کتاب سے ہی مدد لیتے۔[2]

امام بویطی جو تقویٰ و تفقہ دونوں میں سب سے نمایاں ہیں، فرماتے ہیں کہ الربیع اثبت منی فی الشافعی (ربیع، امام شافعی سے روایت کرنے کے بارہ میں مجھ سے زیادہ قابل اعتماد ہیں)۔[3]

امام الائمہ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں امام ربیع سے حدیث کی تخریج کی ہے۔[4]

امام بیہقی نے حاکم سے، انھوں نے اصم سے اور اصم نے ربیع سے امام شافعی کی ایک روایت کو نقل کیا، اس سلسلۂ سند کو بیان کرنے کے بعد علامہ سبکی لکھتے ہیں کہ یہ ایسا سلسلۂ سند ہے کہ اگر کسی مجنون دیوانہ پر پڑھ کر دم کیا جائے تو وہ اچھا ہو جائے۔[5]

---

[1] طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۵۹ [2] ابن حجر عسقلانی ج ۳ ص ۲۴۶ [3] ایضاً [4] ایضاً۔

[5] طبقات کبریٰ ص ۳۴۰۔

صاحبُ المثنوی

یہ فارسی زبان کے مشہور صوفی و عارف، مثنوی نگار اور فارسی کی سب سے مشہور صوفیانہ مثنوی کے مصنف مولانا جلال الدین رومی کی بہت ہی مفصل سوانح عمری ہے، حضرت تبریز کی ملاقات کے بعد ان میں جو غیر معمولی روحانی تغیرات پیدا ہوئے اور ان کے فراق میں دیوانگی کی جو کیفیت ان پر طاری ہوئی اس کو اور ان کی زندگی کے اور بہت سے واقعات کو بہت ہی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، مولانا شبلی کی سوانح مولانا روم کے بعد جس میں انھوں نے ان کو ایک متکلم کی حیثیت سے پیش کیا ہے، مولانائے روم کے حالات میں بہت ہی مستند کتاب، از قاضی تلمذ حسین صاحب۔ قیمت ۲۱ روپے۔

مکتوب مکہ

از- ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی پروفیسر ملک عبدالعزیز یونیورسٹی،

بنام سید صباح الدین عبدالرحمن

محترم و معظم سید صاحب زید مجدہ۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہٗ

گزشتہ ماہ دارالعلوم کے مہمان خانہ میں کئی دن مجھے جناب سے قریب رہنے کا موقع ملا، اس سے پہلے بھی نیاز کا شرف حاصل رہا، مگر مختصر لمحات کے لیے، الحمد للہ اس مرتبہ بہت کچھ تشنگی دور ہوئی اور بڑھی بھی، اللہ تعالےٰ آپ کو تا دیر سلامت با کرامت رکھے، استاد محترم مولانا عبدالسلام قدوائی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے جو زخم کاری لگا ہے، وہ بیان سے باہر ہے آپ کا وجود اب ہم لوگوں کے لئے مرہم ہے، خدا کرے آپ کے ہاتھوں کچھ اچھے نوجوان تربیت پا جائیں، اور دارالمصنفین کو اس کی روایت اور علمی مرتبہ کے مطابق چلا سکیں، ہم دور افتادہ تہی دست سوائے دعا و تمنا کے کچھ بھی اپنے بس میں نہیں پاتے۔

آپ نے مجھ پر بڑا کرم فرمایا، کہ "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" میرے لیے فراہم کرا دیں یہ کتاب میرے لیے بہترین زاد سفر ثابت ہوئی، سفر کی منزلیں آپ کی معیت میں بہت خوشگوار طریقہ پر گزریں، معاصر عرب ادبا جب کسی کتاب کے مطالعہ اور اس سے مستفید ہونے کا ذکر

کرتے ہیں تو کہا کرتے ہیں، عشت مع کتاب ... (کتاب کا نام) یعنی میں اس کتاب کی معیت میں جیتا رہا، یہ لفظی ترجمہ ہوا، مطلب یہ ہے کہ ایک زندہ شخصیت کی جس طرح معیت ہوتی ہے، اسی طرح یہ کتاب ایک رفیق رہی۔ میرا حال بھی یہی ہے کہ "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" میرے ساتھ اسطرح تھی جیسے خود مصنف کی صحبت نصیب رہی ہو۔

اس عریضہ میں جب کہ آپ سے مخاطب ہوں، کتاب کے متعلق، اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے جھجھک محسوس کرتا ہوں کسی کے منھ پر اس کی تعریف بھلی نہیں معلوم ہوتی، لیکن اظہار شکر و اعتراف میں بھی کوئی بات مانع نہیں ہے، میرا واقعی تاثر یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد غالب پر مزید کچھ پڑھنا وقت کے ساتھ ناانصافی ہے، عربی نحو میں سیبویہ کی کتاب کے بارے میں ابو عثمان المانی کا مشہور فقرہ یاد آتا ہے "من اراد أن یعمل کتابا کبیرا فی النحو بعد سیبویہ فلیستحی" یعنی اگر کوئی شخص سیبویہ کی کتاب النحو کے بعد اس فن میں کسی بڑی تصنیف کا ارادہ کرے تو اس کو شرم آنی چاہئے"۔ غالب کے موضوع پر اگر کوئی لکھنا چاہے تو اس کتاب (مدح و قدح کی روشنی میں) کے بعد اس کو شرم محسوس کرنا چاہئے۔

میں نہیں جانتا کہ اس کتاب سے کس نے کس درجہ فائدہ اٹھایا، میں کوئی ناقد نہیں ہوں، ہاں اپنی بات عرض کرسکتا ہوں کہ مجھے کیا فائدے ہوئے،

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کتاب سے پہلی بار معلوم ہوا کہ غالب پر ابتک کیا کچھ لکھا جاچکا ہے، ضخیم تذکروں سے لیکر علمی رسائل کے مقالات تک بلکہ سیمنار میں پڑھے جانے والے مقالات تک کا اس میں جائزہ موجود ہے، حالی اور نواب امداد امام اثر سے لیکر معاصر اہل قلم اور محققین کے افکار و خیالات سب یک جا مل جاتے ہیں،

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ غالب کے مادح و قادح دونوں سامنے آگئے اور اس کتاب کی

بدولت ان کے علمی و تحقیقی مراتب سے واقفیت ہوئی، ضمناً ان کے حالات زندگی، خاص کارنامے اور سنین وفات و تاریخ تصنیف سب سے واقفیت ہوگئی، بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ تاریخ کے ملبوں کے نیچے دب گئے ہیں، بہت ہی خاص الخاص اہل علم ان سے واقف ہیں، کتنے ہیں جنھوں نے آب حیات، گل رعنا اور شعر الہند کے علاوہ کاشف الحقائق اور گلشن بے خار کا بھی مطالعہ کیا ہو،

تیسری بات یہ ہے کہ آپ نے ناظرین کو دوسروں کے نقطۂ نظر سے آگاہ کر دیا اور خود بہت کامیابی کے ساتھ غیر جانبدار رہے، تائید نہ تو مادحین کی ہوئی، اور نہ قادحین کی، البتہ مادحین و قادحین کے بیان میں جو تضاد ہے، اس کو ظاہر کر دیا۔

بہر نوع تحقیق و ترتیب کے لحاظ سے یہ کتاب دار المصنفین کی روایات کے صرف مطابق ہی نہیں بلکہ ایک قابل قدر اضافہ ہے، یادگار غالب نے اگر غالب کو حقیقی معنوں میں روشناس کرایا تھا، تو آپ کی اس کتاب نے غالب کی عمر بڑھادی، اللہ آپ کی عمر جسدی و معنوی کو بڑھائے۔

یادگار غالب کا نام آگیا تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی نوعمری میں یہ کتاب پڑھی تھی مگر اس کے نقوش حافظہ میں قائم ہیں، اس سلسلہ میں ایک طالب العلمانہ اعتراض پیش کرتا ہوں، حالی نے لکھا ہے کہ غالب کو حافظ کے اس شعر پر اعتراض تھا۔

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل \
کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

غالب کہتے تھے کہ پہلے مصرعہ میں جس ہولناکی کا بیان ہے وہ دوسرے مصرعہ میں ختم ہوجاتا ہے ضرورت تھی کہ اس بے بسی اور بیچارگی کے مفہوم کو دوسرے مصرعہ میں بھی پھیلا دیا جاتا۔ (الفاظ یاد نہیں ہیں۔ مفہوم یہی ہے) چنانچہ غالب نے عرفی کی زمین میں جو غزل کہی ہے

ع عصا خفتہ است ، جفا خفتہ است ، اس میں ایک شعر حافظ ہی کے مفہوم کو وسیع کر کے کہا ہے۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتہ است

میرا طالب علمانہ ذہن غالبؔ کے اس شعر کی خوبی کو سمجھنے سے قاصر ہے، باوجود مولانا حالیؔ کی وکالت کے، جن کے علمی درجہ اور اصلاحی خدمات کا معترف ہوں، سوال یہ ہے کہ جب اس درجہ ہولناک صورت حال ہو اس وقت "ناخدا" کو نیند کیونکر آسکتی ہے، یہ وقت تو وہ ہے، کہ اور چوکنا ہو اور اپنی آخری تدبیر کشتی کو بچانے کی کر ڈالے، نہ کہ پڑا سوتا رہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ غالبؔ کے ساتھ اولڈ ٹائم یا کاسن ٹین کی بوتلیں چڑھا کر نشہ میں مردہ کے مانند پڑا ہو۔ مگر اس صورت میں خفتہ است کے بجائے مردہ است ہونا چاہیے تھا۔

کبھی ملاقات ہوگی تو اس موضوع پر آپ کی رائے معلوم کرونگا، جو میرے لیے سند ہوگی، یوں اتنی اہم بات نہیں ہے کہ آپ اس کے جواب کے لیے اپنا وقت ضائع فرمائیں۔

زیادہ تحیات و احترام

نیازمند

عبداللہ عباس ندوی

۲۷ ستمبر ۱۹۷۹ء

اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں

ہندوستان میں، اسلامی علوم وفنون کی شاندار خدمات کی تفصیل۔ از مولانا سید عبدالحئی صاحب نزہۃ الخواطر۔ ترجمہ مولانا ابو العرفان ندوی۔

قیمت ۲۰ روپیے

بابُ التقریظ والانتقاد

اردو رسالوں کے خاص نمبر

جامعہ مولانا محمد علی نمبر:- مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی و عبداللطیف اعظمی، بڑی تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۱۶، قیمت ۸ روپیے، پتہ: ماہنامہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے صد سالہ یوم ولادت کے موقع پر اردو کے کئی رسالوں نے اپنے خاص نمبر شائع کرکے ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، مولانا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی تھے، اس لئے اس کے ترجمان ماہنامہ جامعہ نے بھی ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر شائع کیا ہے، جو اس کی روایتی شان کے مطابق اچھے اور بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے گو چند مضامین پرانے ہیں مگر اہمیت اور فائدے کی بنا پر ان کو بھی شامل کیا گیا ہے، پہلے مضمون کی حیثیت مولانا کے خود نوشت حالات کی ہے، اس کا اردو ترجمہ بہت پہلے پروفیسر محمد سرور نے کیا تھا، جناب عبداللطیف اعظمی نے اس کی تلخیص کی ہے اور اس پر مفید حواشی بھی تحریر کئے ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم اور جناب معین الدین حارث نے مولانا محمد علی کے بارہ میں اپنے اپنے تاثرات موثر اور دلکش انداز میں قلمبند کئے ہیں، جناب عتیق صدیقی نے تذکرہ کاملان رام پور کی مدد سے مولانا کے خاندانی حالات پر روشنی ڈالی ہے، چند مضامین میں مولانا کی قومی و سیاسی زندگی، تحریک خلافت اور بعض معاصرین سے ان کے تعلقات وغیرہ کا ذکر ہے، ان کے اردو اور انگریزی اخباروں پر بھی ایک ایک مضمون درج ہے، جناب عبداللطیف اعظمی نے مولانا کے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تعلق و وابستگی کی روداد بیان کی ہے، فاضل مرتب کا مضمون اور خصوصاً ان کا افتتاحیہ قابل توجہ ہے، افتتاحیہ میں دو ایسے امور کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی جانب مولانا کے سوانح نگاروں نے

ابھی تک دھیان نہیں دیا ہے، تعارف و تبصرہ کے کالم میں مولانا پر حال میں شائع ہونے والی مطبوعات اور خاص نمبروں کا ذکر ہے، شعراء کا منظوم خراجِ عقیدت بھی اثر انگیز ہے۔ مولانا محمد علی کی کئی تصویروں کے علاوہ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک غزل، ان کے انگریزی اخبار کامریڈ اور اردو اخبار ہمدرد کے سرورق کا عکسی فوٹو بھی دیا گیا ہے، اس نمبر کے اکثر مضامین ان ہی لوگوں کے قلم سے ہیں جن کو مولانا سے براہ راست واقفیت یا عقیدت تھی، مگر پروفیسر محمد مجیب کا مضمون دوسری نوعیت کا ہے، در حقیقت مولانا محمد علی کی ذات و شخصیت میں متضاد اوصاف و خصوصیات جمع ہو گئے تھے اور ان میں غیر معمولی ذہانت اور شدید ذکاوتِ حس بھی تھی، اس کو مد نظر رکھا جائے تو ان کے متعلق رائے قائم کرنے میں اعتدال برقرار رہ سکتا ہے، اب تک مولانا پر جو نمبر شائع ہوئے ہیں، ان میں یہ زیادہ ممتاز ہے، اس سے ان کی مذہبیت، بے چین زندگی، بیقرار طبیعت، پُر عظمت شخصیت اور کمالات کی تصویر بڑی حد تک سامنے آ جاتی ہے۔

تحریک سلور جبلی نمبر:۔ مرتبہ جناب گوپال متل، مخمور سعیدی، پریم گوپال متل صاحبان، بڑی تقطیع، کاغذ کتابت طباعت عمدہ، صفحات ۴۲۸ قیمت ۲۵ روپے، پتہ: ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی

ماہنامہ تحریک اردو زبان کا مشہور و مقبول ادبی رسالہ ہے، اس کے خاص نمبر اہتمام سے شائع ہوتے رہتے ہیں، ۱۹۷۸ء میں تحریک کی اشاعت کو پچیس برس ہو گئے تھے، اس مناسبت سے یہ نمبر شائع کیا گیا ہے، اصلاً اس کے دو حصے ہیں، پہلے میں بڑا حصہ طبعزاد مضامین، افسانوں اور منظومات کا ہے، اس حصہ میں انگریزی سے کئے گئے دو ترجمے بھی دئے گئے ہیں، ایک میں موجودہ سیاسی اصطلاحوں کا تعارف اور ان کی مختصر تشریح ہے، اس خاص نمبر کی ابتداء ادبی تحقیقی اور تنقیدی مضامین سے کی گئی ہے، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، مکیش اکبرآبادی، رشید حسن خاں، مشفق خواجہ اور محمد مشتاق شارق کے مضامین ادبی و تحقیقی حیثیت سے اہم اور دلچسپ ہیں، شمس الرحمان فاروقی نے موجودہ ادبی تنقید کا اور ڈاکٹر مغنی تبسم نے گذشتہ پچیس برس کی اردو تنقید کا مبسوط جائزہ لیا ہے، دوسرے مضامین میں اردو کے جدید افسانے اور غزل کا جائزہ لیا گیا ہے، کمیونزم کا رد تحریک کا خاص مشن ہے، فاضل مرتب اور

ستیہ پرکاش کے مضامین اسی نوعیت کے ہیں، اس نمبر کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ ہندوستانی ادیبوں کی طرح یہ متعدد پاکستانی اہل قلم کی نگارشات سے بھی مزین ہے، اور اس کا ایک حصہ پاکستان کے بعض اصنافِ ادب کے جائزے کے لئے مخصوص ہے، ان سنجیدہ ادبی مضامین کے علاوہ افسانے، ڈرامے اور نظموں و غزلوں کا طویل حصہ بھی جاندار ہے، پہلے حصہ میں جناب ترقی زادہ نے مولانا شبلی کے فارسی مجموعۂ کلام دستۂ گل، بوئے گل اور برگ گل کی متعدد منتخب غزلوں کا کامیاب اردو ترجمہ کیا ہے، جناب گوپال متل نے خاص انداز سے اس کا مختصر تعارف لکھا ہے، ان غزلوں کے ترجمے کی اشاعت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ شبلی کی علمی اور دینی حیثیت کی طرح ان کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت بھی مسلمات کا درجہ رکھتی ہے" دوسرا حصہ بھی مضامین نظم و نثر کا رنگا رنگ مجموعہ ہے، اس میں ملک کی موجودہ سرکاری زبان ہندی کے علاوہ کئی علاقائی زبانوں پنجابی، کشمیری، اڑیہ، تامل، تلگو، مراٹھی، کنڑا، گجراتی اور راجستھانی کے موجودہ ادبی سرمایہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان زبانوں کی نظموں اور افسانوں کے اردو ترجمے بھی دئے گئے ہیں، اس طرح اس نمبر سے اردو زبان و ادب ہی کی طرح ملک کی اکثر مشہور زبانوں کی موجودہ ادبی رفتار اور ہندوستان و پاکستان دونوں کی آزادی کے بعد کی ادبی سرگرمیوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے، اور نئے ادبی مسائل و رجحانات سے واقفیت ہوتی ہے اور اردو کے متعارف و غیر متعارف ادیبوں کی کد و کاوش کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، یہ نمبر بہت ضخیم ہے، ظاہر ہے کہ سب مضامین یکساں نوعیت کے نہیں ہیں، خصوصاً جب کہ اکثر لکھنے والے نئے ہوں تو تحریر، طرز نگارش اور خیالات میں ناہمواری بھی ہوگی، مگر موجودہ حالات میں ایسے ضخیم نمبر کی اس قدر سلیقہ اور ڈھنگ سے اشاعت ہی ایک بڑا کام ہے جو گوپال متل صاحب جیسے معمر مگر جواں ہمت اردو کے خدمت گذار ہی انجام دے سکتے ہیں، مضامین کے تنوع کی وجہ سے ہر مذاق کے لوگ اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، شروع میں تقریباً ڈیڑھ سو ادیبوں اور شاعروں کے فوٹو بھی

دئے گئے ہیں، جن کی نگارشات اس نمبر میں درج ہیں۔

الرشید مدنی واقبال نمبر:- مرتبہ جناب چوہدری عبدالرشید ارشد صاحب، وغیرہ بڑی تقطیع کاغذ کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۷۲، قیمت عشہ، پتہ: ناظم جامعہ رشیدیہ، ساہیوال (پاکستان)

الرشید جامعہ رشیدیہ ساہیوال کا ایک دینی وتبلیغی رسالہ ہے، اس کا بڑا مقصد دیوبندی فکر ومسلک کی ترجمانی واشاعت اور اکابر دیوبند کی حمایت ومدافعت ہے، اس سے قبل اس کا دارالعلوم دیوبند نمبر شائع ہوا تھا، یہ مدنی واقبال نمبر ہے جو اکثر مطبوعہ تحریروں اور مضامین پر مشتمل ہے شروع میں مولانا حسین احمد اور ان کے استاذ شیخ الہند پر سیر حاصل مضامین ہیں، دوسرے مضامین میں مولانا مدنی کے "متحدہ قومیت" کے نظریہ کو صحیح ثابت کرکے اس پر اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اس ضمن میں ڈاکٹر اقبال کے اعتراضات کا خاص طور پر ذکر ہے، اور ارمغان حجاز کے اشعار کے بارہ میں یہ وضاحت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان سے رجوع کر لیا تھا، بعض مضامین میں اقبال پر نام واطنز وتعریض بھی ہے، یہ مضامین جب شائع ہوئے تھے، اسی زمانہ میں ان پر اعتراضات کئے گئے تھے اور اب بھی یہ قابل بحث ہیں آخر میں ڈاکٹر صاحب پر چند مستقل مضامین ہیں، "اقبال اور عصری نظامِ تعلیم" کے عنوان سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بھی ایک مضمون نقل کیا گیا ہے، دوسرے مضامین میں اقبال کی اسلام پسندی، علماء کی قدردانی، وہابی تحریک سے دلچسپی، انکارِ حدیث اور قادیانیت وغیرہ سے برات کا ذکر اس غرض سے کیا گیا ہے کہ ان طبقوں کے لوگوں پر واضح ہو جائے کہ اقبال ان کے ہمنوا نہ تھے، مولانا حسین احمد اور اقبال سے متعلق مضامین کی اشاعت کا مقصد اس طعن وتشنیع کا جواب ہے جس کا ہدف پاکستان میں نمکگان دیوبند خصوصاً مولانا مدنی کی ذات کو بنایا گیا ہے، مرتب کے خیال میں یہ در اصل اقبال کے وہ پرانے مکفرین ہیں جو تقسیم سے پہلے انگریزوں کا آلۂ کار تھے اور تقسیم کے بعد پاکستان میں مسلم لیگ کی شکست وریخت کا سامان بنے، اس نمبر کے تقریباً سب ہی مضامین پرانے ہیں تاہم اس نمبر میں یہ منتشر ذخیرہ یکجا اور محفوظ ہو گیا۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

مستند موضح القرآن:- مصححہ مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، مجلد قیمت آٹھ روپے، پتہ ناشر رحمت عالم ایجنسی ۶ چاندنی اسٹریٹ لال کنواں دہلی ۶

مولانا اخلاق حسین قاسمی نے "محاسن موضح القرآن" اور "موضح قرآن کی کتابتی غلطیوں پر تبصرہ" کے نام سے دو کتابیں پہلے شائع کی تھیں، معارف میں ان کے تبصرہ کے ضمن میں اس کا ذکر آچکا ہے کہ وہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے اردو ترجمہ قرآن وفوائد کا ایک صحیح ایڈیشن بھی مرتب کر چکے ہیں، اب انھوں نے اس کی یہ پہلی قسط شائع کی ہے، اس میں آخری دو پارے انتیس ۲۹ اور تیس ۳۰ کے ترجمے اور تفسیری فوائد شامل ہیں، ابھی تک اردو میں قرآن مجید کے کسی ترجمہ کو حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ جیسی شہرت ومقبولیت نصیب نہیں ہوئی، لیکن یہ تقریباً دو سو برس پہلے کا ہے اور اب اردو کا اسلوب بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے، بعض الفاظ اور ترکیبیں متروک ہو چکی ہیں، علاوہ ازیں ناشروں کی بے پروائی سے اس میں، برابر غلطیاں بھی راہ پاتی رہی ہیں، اس لئے مولانا اخلاق حسین کو شاہ صاحب کے ترجمہ وفوائد کا ایک صحیح ایڈیشن مرتب کرکے شائع کرنے کا خیال ہوا، اس مبارک ارادہ کی تکمیل میں اہل خیر کو ان کا تعاون کرنا چاہئے، ان کو قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کے کام سے دلچسپی بھی ہے اور وہ اردو زبان کے نوک پلک سے بھی واقف ہیں، اس لئے انھوں نے سلیقہ اور حسنِ مذاق سے یہ ایڈیشن شائع کیا ہے، شروع میں موضح قرآن کے قدیم، متروک اور مشکل الفاظ کی تشریح اور ان غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے جو ناشروں کی ترمیم وتصرف یا غفلت کا نتیجہ ہیں، اگر اس قسط میں

مکمل قرآن کے بجائے صرف آخری دو پاروں ہی کے مشکل و متروک الفاظ اور اغلاط کا ذکر ہوتا تو قارئین کو الجھن نہ ہوتی، مشہور پیغمبروں کی فہرست میں ہابیل، قابیل، طالوت، جالوت اور حضرت مریم وغیرہ کا نام کس طرح دیا گیا ہے، مصنف کا یہ دعویٰ خلافِ واقعہ ہے کہ پہلی مرتبہ اس ترجمہ کی تصحیح و تشریح کی سعادت ان کو نصیب ہو رہی ہے، کیونکہ ان سے پہلے بھی بعض اہل علم کے حصہ میں یہ سعادت آچکی ہے، خود شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا ترجمۂ قرآن در اصل شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمہ ہی کی تسہیل و تجدید ہے، شاہ صاحب کے ترجمہ کا ایک اور صحیح ایڈیشن ادارۂ علوم شرعیہ کراچی نے بھی شائع کیا ہے، اس پر مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند کا مقدمہ بھی ہے، ان کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ شاہ عبد القادر صاحب کا ترجمہ اردو کا سب سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے، اُن سے پہلے بھی کلام مجید کے بعض اردو ترجمے ہو چکے تھے۔

سرگذشت حیات :۔ مترجمہ جناب شیخ نذیر حسین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت ٹائپ، صفحات ۳۱۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت بیس ۲۰ روپیے۔

پتہ : مجلس ترقی ادب، لاہور (پاکستان)

ڈاکٹر احمد امین زمانۂ حال کے مشہور فاضل تھے، ان کی تصنیفات میں فجر الاسلام، ضحی الاسلام، اور ظہر الاسلام کو بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی، وہ مصر کے ایک معمولی گھرانے کے فرد تھے، مگر اپنی محنت، مطالعہ اور شوق کی بدولت غیر معمولی ترقی کی اور بڑا علمی اعزاز حاصل کیا، انھوں نے 'حیاتی' کے نام سے اپنے خود نوشت حالات لکھے تھے، یہ کتاب اس کا اردو ترجمہ ہے، اس میں ان کے بچپن سے بڑھاپے تک کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز کا ذکر ہے، شروع میں اپنے خاندان، والدین، ماحول اور محلے وغیرہ کا حال تحریر کیا ہے، ان کو ترکی، شام، فلسطین، عراق اور یورپ جانے کا اتفاق بھی ہوا تھا، اس میں ان ملکوں کا سفرنامہ بھی آگیا ہے، مصنف کی جن مکاتب و مدارس میں

تعلیم ہوئی اور جہاں انھوں نے درس و تدریس کی خدمت انجام دی، ان سب کے تعلیمی و انتظامی حالات بیان کرکے ان کی خوبیاں اور خامیاں واضح کی ہیں، اس ضمن میں جامعہ ازہر کے طریقۂ تعلیم کے نقائص کا ذکر بھی ہے، ان کا بڑا کارنامہ جامعہ شعبیہ (عوامی یونیورسٹی) کا قیام ہے، اس کے علاوہ بعض تصنیفی اداروں سے بھی وہ وابستہ رہے، ان سب کے متعلق بھی اس میں معلومات قلمبند کئے ہیں، مصنف اصلاً علمی آدمی تھے، ان کی پوری زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گذری، اس لئے یہ کتاب ان کی خاموش مگر علم و تعلیم کے لئے وقف زندگی کی مکمل داستان ہے جو طالب علموں کے لئے بہت سبق آموز ہے، اس کتاب سے مصر کے علمی و تعلیمی حالات کے علاوہ وہاں کے ذہنی و فکری رجحانات، معاشرت اور اس دور میں مصر کے اندر مشرق و مغرب کی کشمکش کا اندازہ بھی ہوتا ہے، شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی کے نام اور کارناموں سے معارف کے ناظرین بخوبی واقف ہیں، انھوں نے ایسا سلیس، شگفتہ اور رواں ترجمہ کیا ہے کہ یہ سرے سے ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا، اس کی اشاعت سے اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا، اس کے لئے مترجم اہل ذوق کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

معاصرین :۔ مرتبہ جناب حکیم عبد القوی دریابادی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۳۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت بیس روپیے، پتہ ادارۂ انشائے ماجدی، ۱۴۷، رابندر سرانی، کلکتہ

یہ کتاب مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کے جادو نگار قلم کی یادگار ہے، اس میں ان کے اسّی معاصرین کا سوانحی خاکہ درج ہے، مولانا کے وسیع حلقۂ تعارف میں ہر طبقۂ خیال و مسلک اور مختلف مذہب و ملت کے افراد شامل تھے، اس لئے زیر نظر کتاب متنوع اور رنگا رنگ شخصیتوں کا ایسا آئینہ ہے جس میں مذہبی، علمی، تعلیمی، ادبی، قومی اور سیاسی ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اصحاب کمال کے جلوے نظر آتے ہیں، اس کے تین حصے ہیں، پہلے میں ایسے اشخاص کی سیرت و شخصیت کے خط و خال

نمایاں کیے گئے ہیں جو مولانا سے عمر میں بڑے تھے، دوسرے حصہ میں برابر والوں کا ذکر ہے اور آخری حصہ میں مولانا نے ایسے اشخاص کی خصوصیات و کمالات بیان کیے ہیں جو ان سے سن و سال میں چھوٹے تھے، ناموں کی فہرست طویل ہے، اس میں علماء و مشایخ، شعراء و ادباء، صحافت و تعلیم کے ماہرین اور قومی، ملی اور سیاسی رہنما سب ہی شامل ہیں، مسلمانوں کی طرح ہندوؤں اور انگریزوں کا سوانحی خاکہ بھی ملا ہے، تقریباً سب ایسے منتخب و ممتاز لوگ تھے جن سے مولانا کے تعلقات تھے، اور وہ ان کی شخصیتوں سے کسی حد تک متاثر بھی تھے، گو یہ خاکے مختصر اور سرسری ہیں، مگر مولانا کے پُرنور اور دلکش قلم نے ان میں ایسا رنگ بھر دیا ہے کہ ہر صاحب تذکرہ کا سراپا نظر کے سامنے آگیا ہے، اور ان کے احساس و مشاہدہ کی قوت و گہرائی نے ہر شخص کی سیرت کا اصل جوہر کھینچ دیا ہے، مولانا کی ہر تحریر کی طرح یہ کتاب بھی ان کے منفرد اسلوب نگارش، اچھوتے انداز بیان اور ادب و انشاء کی لطافت و رعنائی سے معمور ہے، آیندہ جو لوگ ان شخصیتوں پر کام کریں گے ان کو اس سے بڑی مدد ملے گی، بلکہ آیندہ جو کچھ لکھا جائے گا وہ مولانا کے اجمال کی تفصیل ہوگی، مگر کئی حضرات کا نام قلم انداز ہو گیا ہے، یہاں تک کہ بڑوں میں مولانا حسین احمد مدنی اور خوردوں میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم اور جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کا ذکر بھی رہ گیا، حالانکہ اول الذکر سے مولانا بیعت تھے اور موخر الذکر دونوں حضرات مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اور مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کے بعد دار المصنفین کے روح رواں ہو گئے تھے، جن سے مولانا کا مدۃ العمر تعلق رہا۔

تلسی داس اور رام چرت مانس:۔ مرتبہ ڈاکٹر صفدر آہ صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۹۰، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت ۱۵ روپیے، پتہ: مہاتما گاندھی میموریل، ریسرچ سینٹر اور لائبریری ایم۔ جی۔ میم بلڈنگ نیتا جی سبھاش روڈ بمبئی۔

ہندوستان کی قدیم زبانوں اودھی اور برج بھاشا وغیرہ کے نامور شاعر تلسی داس کی شخصیت اور شاعری کے بارہ میں اردو میں کم لکھا گیا ہے، اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں بھی مبالغہ اور افسانہ زیادہ ہے، اس کی تلافی کے لیے ڈاکٹر صفدر آہ نے یہ کتاب لکھی ہے، اس کے پہلے حصہ میں تلسی داس کے حالات و کمالات بیان کیے گئے ہیں، اور دوسرے میں ان کے لازوال ادبی کارنامہ "رام چرت مانس" پر مبسوط تبصرہ ہے، پہلے حصہ میں تلسی کے سنہ ولادت، ان کے بیراگ اور تصویر وغیرہ کے بارے میں محنت سے معلومات جمع کیے گئے ہیں، آخر میں رام چرت مانس کا مفصل تعارف ہے، اس میں اس کی زبان، اسلوب بیان، قصہ، روایات، ماخذ، پلاٹ، کردار اور فنی خصوصیات کو ظاہر کر کے اس کے ادبی درجہ کا تعین کیا ہے، مصنف نے رام چرت کی خوبیاں اور خامیاں دونوں دکھائی ہیں، اور تلسی کے کلام کا سور اور جائسی وغیرہ کے کلام سے موازنہ بھی کیا ہے، ابھی تک اردو میں اس موضوع پر کوئی اچھی کتاب نہ تھی، اس حیثیت سے مصنف قابل مبارکباد ہیں، لیکن ان کے بعض خیالات سخت قابل اعتراض ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں: "مشرق وسطیٰ میں اسلام پھیلا تو بڑی سرعت سے۔ لیکن بعد میں یہ مذہب سے زیادہ اقتدار پرستی اور روحانیت سے زیادہ ملک گیری کا جنون بن گیا، کسی ملک پر حملہ کر کے اسے اپنا مطیع بنانا، خواہ خدا کے نام پر ہو یا مذہب کے نام پر، ایک وحشیانہ فعل ہے، جس کی اجازت تہذیب کسی طرح نہیں دے سکتی...... (ہندوستان پر) ابتداً جن افغانی حملوں کا سلسلہ شروع ہوا وہ کم و بیش عسکری قزاقی تھی"۔ آگے اورنگ زیب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ان کے الجھے ذہن کا پتہ چلتا ہے، مصنف رائے قائم کرنے اور دوسروں کی تردید کرنے میں غور و فکر کے بجائے عجلت سے کام لیتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کا انداز غیر ذمہ دارانہ ہو گیا ہے، کتاب میں زبان و بیان کی بکثرت خامیاں بھی ہیں، جیسے "پھر انتزاع وقت کے ساتھ واقعات اس طرح مسخ ہوئے ہیں (ص ۵) اس افراطی نظریے کی تائید

.....(ص ۹) قبل اس کے کہ ہم اس دشوار تجسس کو شروع کریں (ص ۱۳) اس خرافات مواد کا اگر .....(ص ۵۴) چونکہ تلسی اوتاری انسان .... (ص ۵۵) پرانے شعرا میں شاذ ہی ایسے مجموعے ہوں گے (ص ۳۷) وہ بچپن ہی سے ایک سنیاسی گرو کے زیر سایہ پرورش ہوئے (ص ۵۸) شرہند ھو ہندی کے نامور مصنف ہیں، ان کا عہد وقوع آج سے ۵، سال قبل سمجھنا چاہئے (ص ۹۲) ایسی مثالوں کو زہر میں ڈوب دے کر اچھالنا ادیب کا کام نہیں ہے (ص ۱۱۵) ان محاسن پر سارا ہندوستان گرویدہ رہا (ص ۲۸۲)، مندرجہ ذیل جملوں میں الفاظ کی تقدیم وتاخیر کا خیال نہیں کیا گیا ہے: "ایک تقریباً دوسو سال پرانی کتاب" (ص ۴۴) تلسی کے عہد میں جو ہندو سماج کی تہذیب رائج تھی (ص ۱۱۲) ایک جگہ بہین کو بہن لکھا ہے۔ "تقریباً ساڑھے چار سو سال کے بہن پر پھیلے ہوئے مواد .... (ص ۵) جورت کو مذکر لکھا ہے۔

صحیفۂ زندگی: از مولانا عزیز الحق کوثر ندوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۴۰ قیمت ۵ روپے، پتہ: مکتبہ سراجیہ ۸/۳۱ جے گجی باغ، وارانسی۔

مولانا عزیز الحق کوثر ندوی کو درس وتدریس اور وعظ وارشاد کے علاوہ تصنیف و تالیف اور شعر وسخن کا بھی اچھا ذوق ہے، ان کے قلم سے مختلف علمی ودینی موضوعات پر کئی مفید رسالے نکل چکے ہیں، "صحیفۂ زندگی" ان کے کلام کا مجموعہ ہے، اس میں دینی واخلاقی تعلیمات اور تصوف وسلوک کے حقائق بیان کرکے روح کی بالیدگی کا سامان بہم پہونچایا ہے، اور قلب وذہن کی صفائی، سیرت وکردار کی پاکیزگی اور معاشرہ کی اصلاح کا درس دیا ہے مگر خیالات ومضامین کی گرانباری سے نظم کی روانی، اشعار کی موزونی اور بندش کی چستی وغیرہ میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے اس اعتبار سے "صحیفۂ زندگی" اسم بامسمیٰ ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۴ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۹ء عدد ۶

مضامین